درس ١٦

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ

شہادت علی الناس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

o

''طالب ومطلوب'' کی نسبت کے حوالے سے

فلسفۂ دین کی اہم بحث

حقیقتِ جہاد سے متعلق بعض بنیادی باتوں کی وضاحت پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ اب ہمیں مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے پہلے باقاعدہ درس کا آغاز کرنا ہے جو سورۃ الحج کے آخری رکوع پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ہمارے اس منتخب نصاب کے اس مرحلے پر جو مضمون زیرِ بحث ہے اس سے اصلاً اس رکوع کی صرف آخری آیت ہی متعلق ہے' لیکن یہ پورا رکوع' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' قرآن مجید کے انتہائی جامع مقامات میں سے ہے۔ اور اس مرحلے پر کوشش یہ ہو گی کہ اختصار کے ساتھ اس پورے رکوع کے مفہوم کو کسی درجے میں بیان کر دیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ہمارے اس منتخب نصاب میں اب تک جتنے مضامین آئے ہیں ان کا ایک مختلف انداز اور اسلوب میں اجمالی اعادہ ہو جائے گا۔

دو تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ اس رکوع کی آیات کا مطالعہ کیا جائے' دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ان کا مستحضر رکھنا قرآن حکیم سے ایک ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لیے بہت مفید ہو گا۔ ایک بات تو اجمالاً پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتوں کی ابتدائی اور اختتامی آیات نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ ویسے بھی ایک عام قاعدہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی غزل کا مطلع اور مقطع خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ قصیدے کا ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی خطبے کا اگر آغاز ایسا ہو کہ خطیب اپنے سامعین کی توجہ کو جذب کرے اور اختتام ایسا ہو کہ وہ اپنے سامعین پر کوئی دائمی تأثر چھوڑ جائے تو وہ خطبہ کامیاب ہو گا۔ قرآن مجید اصلاً خطبے کے اسلوب پر نازل ہوا ہے اور اس کی اکثر سورتوں کی حیثیت خطبوں کی سی ہے۔ چنانچہ ان کے آغاز میں آنے والی آیات اور جن آیات پر ان سورتوں کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم بہت جامع' بہت مؤثر اور توجہ کو جذب کر لینے والی ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی چند آیات پڑھ چکے ہیں۔ ان آیات کے حوالے سے بھی یہ حقیقت سامنے آئی تھی' لیکن سورۃ الحج کے اس آخری رکوع کے حوالے سے یہ حقیقت مزید مبرہن ہو جائے گی۔

اس رکوع کی چھ آیات میں جامعیت کا جو عالم ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کیجیے کہ پہلی چار آیات میں خطاب ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' (اے لوگو!) سے ہے۔ اور ان میں گویا کہ قرآن مجید کی وہ دعوتِ عام ہے جو وہ ہر فرد نوعِ بشر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان آیات میں ان اصولوں کا خلاصہ آ گیا ہے جن کو ماننے کی وہ دعوت دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ وہی اصولِ ثلاثہ ہیں: (۱) توحید (۲) معاد (۳) رسالت۔ اسلام کا پورا قصر انہی تین بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔ لہٰذا پہلی چار آیات میں ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' سے خطاب کا آغاز کر کے ان تینوں باتوں کا ایک ایسا جامع ملخص پیش کر دیا گیا ہے کہ واقعتاً قرآن مجید کے اعجاز کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں خطاب ہے: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ

سے۔ یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے‘ جنہوں نے باتوں کو مان لیا۔ اب اگلی دعوت جو ہے وہ دعوتِ عمل ہے۔ گویا کہ پہلی چار آیات میں دعوتِ ایمان دی گئی اور اب ماننے والوں پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان کے جو تقاضے ہیں انہیں بیان کر دیا گیا۔ اور بڑی منطقی بات ہے کہ جنہوں نے مانا ہی نہیں ان سے کسی عمل کا مطالبہ نہیں ہے۔ ان کے سامنے کسی عملی تقاضے کا پیش کیا جانا بے معنی ہے۔ جنہوں نے خدا کو‘ یا رسول کو‘ یا آخرت کو نہیں مانا‘ اب ان سے کیا کہا جائے کہ نماز پڑھو یا دین کے لیے محنت اور جدوجہد کرو۔ یہ سارے تقاضے دعوتِ عمل کے ہیں۔ یہاں ان کو دو آیات میں سمو لیا گیا۔ اس پہلو سے جب آپ اس پر مزید غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ یہ مقام اس اعتبار سے قرآن مجید کا جامع ترین مقام ہے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید ہے‘ اور ’’وجوہِ اعجاز القرآن‘‘ پر بھی بہت بڑی بڑی محنتیں ہوئی ہیں‘ ان موضوع پر بڑی ضخیم تصانیف موجود ہیں‘ اور میرے نزدیک اعجازِ قرآن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وجوہِ اعجازِ قرآن کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا احاطہ کیا جائے کہ قرآن کن کن اعتبارات سے معجزہ ہے۔ لیکن یہاں ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوئی۔ اس کے اوّلین مخاطب ایک خاص قوم کے افراد اور ایک خاص معاشرہ میں بسنے والے لوگ تھے۔ ان کے کچھ نظریات وعقائد تھے‘ کچھ مذہبی رسوم تھیں‘ اپنے خاص حالات اور معاملات تھے۔ قرآن حکیم کی گفتگو کے پس منظر میں حالات کے اس تانے بانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر قرآن ان سے صرف اصولی باتیں کہتا اور بڑے منطقیانہ اور فلسفیانہ انداز میں اونچی اونچی عقلی باتیں ان کے سامنے رکھتا تو شاید وہ انہیں اپنے سے اتنی زیادہ متعلق معلوم نہ ہوتیں۔ قرآن جس پس منظر میں اور جن ظروف و احوال میں نازل ہوا ہے اس کا عکس قرآن کے اسلوب میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن انہی سے مخاطب ہے‘ ساری بات انہی سے ہو رہی ہے۔ اسی ماحول اور environment سے اپنی گفتگو اور تمام دلائل کے لیے بنیاد فراہم کی جا رہی ہے‘ لیکن دوسری طرف یہی کتاب ایک ابدی ہدایت نامہ ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے فلسفی‘ بڑے سے بڑے سائنس دان اور بڑے سے بڑے حکیم و دانا انسان کی علمی تشفی‘ اس کی علمی پیاس کی سیری اور اس کی عقل اور ذہن و فکر کی رہنمائی تا قیامِ قیامت اسی کتاب کو کرنی ہے۔

اب آپ غور کیجیے کہ یہ کس قدر کٹھن مسئلہ ہے۔ چودہ سو برس پہلے کے زمانے میں نازل ہونے والی ایک کتاب جو ایک طرف ایک ان پڑھ قوم کو اپنے مخاطبینِ اوّل کی حیثیت سے اس طرح خطاب کرتی ہے کہ وہ قوم بھی یہ محسوس نہ کرے کہ اس کی کوئی بات ہمارے سروں کے اوپر ہی سے گزرتی چلی جا رہی ہے اور ہم سے متعلق نہیں ہے‘ دوسری طرف چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کے کسی نابغہ فرد کو‘ کسی علامہ اقبال کو اس درجہ possess کرتی ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ مجھے اگر کہیں کوئی تشفی میسر آئی ہے‘ میری علمی پیاس کے لیے اگر کوئی تسکین کا سامان میسر آیا ہے تو صرف قرآن مجید میں! یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ وہ بات کرتا ہے تو اس انداز میں کہ جو قوم اس کی اوّلین مخاطب تھی گویا اسی سے بات ہو رہی ہے‘ لیکن اسی کے بین السطور میں اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی اور بڑے سے بڑے فہیم و دانا انسان کی عقلی اور فکری رہنمائی کے لیے اپنے اندر پورا سامان لیے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس رکوع کے بعض پہلوؤں کی طرف بعد میں توجہ دلائی جائے گی۔

نوعِ انسانی کے لیے ایمان کی دعوت

اس تمہید کے بعد اب آیئے پہلے اس کی ابتدائی چار آیات‘ جن کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں‘ غور کریں۔ فرمایا:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ

مِنۡهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ ﴿٧٣﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيۡزٌ ﴿٧٤﴾ اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ ۢ بَصِيۡرٌ ﴿٧٥﴾ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿٧٦﴾﴾

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے توجہ سے سنو! یقیناً وہ ہستیاں کہ جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے سوا اس پر قادر نہیں ہیں کہ کسی مکھی تک کو تخلیق کر سکیں' خواہ وہ اس کے لیے مل جل کر کوشش کریں۔ اور اگر کوئی مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ تو اس سے اس کو واپس لینے پر بھی قادر نہیں۔ کتنا ضعیف' کتنا لاچار ہے وہ جو طالب ہے' جو چاہ رہا ہے' اور کتنا کمزور اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جا رہا ہے' جو مطلوب ہے۔ انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا۔ یقیناً اللہ قوی ہے' زبردست ہے۔ اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اللہ تعالیٰ سننے والا' دیکھنے والا ہے۔ جانتا ہے جو کچھ کہ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ کہ ان کے پیچھے ہے' اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹا دیے جائیں گے''۔

یہ ہیں وہ چار آیات جن میں سے پہلی دو آیات میں توحید اور اس کے مقابل کی گمراہی یعنی شرک کا بیان ہے۔ احقاقِ توحید اور ابطالِ شرک کے بعد ایک آیت میں نبوت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم بحث وارد ہوئی ہے۔ اور آخری آیات معاد سے متعلق ہے' یعنی جزا و سزائے آخرت۔

اب یہاں دیکھئے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو بُت پرست ہیں' اصنام پرستی ان کا دین و مذہب ہے' پتھر کی مورتیوں کے سامنے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں' سجدے کر رہے ہیں' گڑگڑا گڑگڑا کر ان سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے کہا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ﴾ ''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے''۔ یہ وہی لفظ ہے جو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہمارے ہاں ''ضرب المثل'' کے نام سے مستعمل ہے۔ ﴿فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ ؕ﴾ تو اسے توجہ سے سنو۔ ''سَمِعَ يَسۡمَعُ'' کے معنی ہوتے ہیں سننا اور ''اِسۡتَمَعَ يَسۡتَمِعُ'' کے معنی ہوں گے توجہ سے سننا' کان لگا کر سننا' دھیان سے سننا۔ چنانچہ یہی لفظ آیا ہے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا﴾ یعنی جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو پوری توجہ سے سنو اور دھیان کے ساتھ اسے سنو اور خاموش رہو۔ تو یہاں فرمایا: ذرا توجہ سے سنو' ایک مثال بیان کی جاتی ہے اُس عمل کی جو تم کر رہے ہو۔ ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ ''بے شک یہ جنہیں تم پکار رہے ہو اللہ کو چھوڑ کر''۔ جن سے دعائیں کر رہے ہو' جن کے سامنے نذریں پیش کر رہے ہو' جن کے لیے چڑھاوے چڑھا رہے ہو۔ ﴿لَنۡ يَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ﴾ ''یہ اس پر بھی قادر نہیں ہیں کہ ایک مکھی تک کی تخلیق کر سکیں' اگرچہ یہ سب جمع ہو جائیں''۔ ﴿وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡئًا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ﴾ ''اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ وہ چیز اُس سے چھڑا نہیں سکتے''۔ یعنی تخلیق تو کیا کریں گے' اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اس سے چھڑانے پر قادر نہیں ہیں۔ ان حلووں مانڈوں پر اور ان چڑھاووں پر کہ جو تم نے ان کے سامنے رکھے ہیں' اگر مکھیاں بھنبھنانے لگیں تو یہ ان کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ ﴿٧٣﴾﴾ ''کمزور ہے چاہنے والا اور جسے چاہا جاتا ہے''۔ یعنی کیا ہی ضعیف ولاچار اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جا رہا ہے' جو مطلوب ہے۔ اور اسی سے اندازہ کرو کہ کتنا لاچار اور بے بس ہے وہ جو اسے چاہ رہا ہے' جو ایسے مطلوب کا طالب بنا ہے۔

معبودانِ باطل کی بے بسی

اب پہلے ذرا اس پر توجہ کیجیے کہ اس مثال سے اگرچہ بظاہر ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ جتنے اہتمام کے ساتھ بات شروع کی گئی تھی کوئی ویسی بڑی بات تو سامنے نہیں آئی' یہ تو آنکھوں کے سامنے کی بات تھی' وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بُت جو ہیں یہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' یہ بُت مکھیوں کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں' پھر ادھر توجہ دلانا چہ معنی دارد؟ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اصنام پرستی یا بُت پرستی کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا ہے' ان کے نظریات کا معاملہ کچھ اور ہے' لیکن عوام الناس میں جو بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے وہ یہی ہے کہ یہی

ہیں ہمارے معبود؛ یہی ہیں ہماری دعاؤں کے سننے والے اور یہی ہیں ہماری مشکل کشائی اور حاجت روائی پر قادر۔ یہ مثال عوام کے اس خیال کو توڑنے کے لیے دی گئی ہے۔ اسی غرض کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عملی تدبیر اختیار کی تھی کہ بُت کدے میں گھس کر تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور ایک بڑے بت کے کاندھے پر وہ تیشہ لٹکا دیا کہ جس سے ان تمام چھوٹے بتوں کو توڑا تھا۔ جب لوگوں کو خبر ہوئی تو ایک زلزلہ آ گیا' ایک طوفان برپا ہو گیا کہ کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا؟ اور جب یہ کہا گیا کہ ہاں' ایک سرپھرا نوجوان ہے' ابراہیم' وہ ان کی توہین کیا کرتا ہے' ان کے بارے میں کچھ ایسی ویسی باتیں کرتا رہتا ہے تو انہیں پکڑ کر لایا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تم نے کیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے پوچھو جس کے کاندھے پر تیشہ موجود ہے' اس نے کیا ہو گا۔ واقعاتی شہادت (circumstantial evidence) تو اسی کے خلاف جاتی تھی۔ جب انہوں نے کہا کہ تم جانتے ہو وہ نہ بول سکتے ہیں' نہ حرکت کر سکتے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ چوٹ لگائی: ﴿اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ﴾ ''تف ہے تم پر اور ان پر کہ جنہیں تم پوجتے ہو''۔ جن کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' کچھ سنتے نہیں' کچھ بولتے نہیں' انہیں پوج رہے ہو! اس پر ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے ایک دم پردہ سا ہٹ گیا۔ قرآن مجید ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے: ﴿فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ انہوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا۔ یہ حقیقت ایک لحظہ کے لیے ان کے سامنے منکشف ہوئی کہ سچ بات وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کہی' ہم ہی مغالطے میں ہیں' ہم کسی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں' لیکن پھر انہوں نے اپنی اُس قومی حمیت' اُس عصبیت جاہلیہ کو مجتمع کیا اور اپنی پوری قوتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف بروئے کار لے آئے۔ یہاں بھی اسی طرح کا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ ذرا سوچو' غور کرو' یہ ہاتھ ہلانے پر قادر نہیں' یہ سب مل جل کر بھی چاہیں تو ایک مکھی تک تخلیق نہیں کر سکتے۔ ان کو پوج رہے ہو' ان سے مرادیں مانگ رہے ہو' ان کے سامنے گڑگڑا رہے ہو؟

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

یہ تو ہوا اس شرک کا ابطال جو اُس وقت معاشرے میں بالفعل موجود تھا۔ اب جو ٹکڑا آیا ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین الفاظ کی ترکیب سے قرآن مجید نے نوعِ انسانی کے لیے ایک بہت بڑی بنیادی رہنمائی فراہم کر دی ہے۔ غور کیجیے کہ وہ ہدایت و رہنمائی کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں نمبر وار اپنے ذہن میں رکھنا مفید رہے گا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق وہی انسان ہے جس کا کوئی نہ کوئی ہدف' کوئی نہ کوئی نصب العین' کوئی نہ کوئی آدرش' کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہے۔ اگر انسان بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے زندگی بسر کر رہا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ انسان نما حیوان ہے اور حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ حیوان کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں۔ زندگی برائے زندگی کا نظریہ انسان کے لیے نہیں ہے' یہ صورت بالفعل حیوانات کے لیے ہے۔ وہ اپنے حیوانی داعیات کے تحت زندہ ہیں۔ انسان ان سے مقصد برآری کرتا ہے' انہیں اپنے کام میں لاتا ہے' لیکن ان کا اپنا کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ انسانوں میں سے بھی جو اس سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں وہ قرآن مجید کے الفاظ میں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ ''وہ چوپایوں کی مانند ہیں' بلکہ ان سے بھی گئے گزرے''۔ انسان وہی قرار پائے گا جس کا کوئی مقصد اور نصب العین معین ہو' جس کے لیے وہ محنت اور جدوجہد کر رہا ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر مقصد اور نصب العین اعلیٰ ہے تو اس کے لیے جدوجہد کر کے انسان خود بھی ایک بلند تر اور اعلیٰ شخصیت کی تعمیر کر سکے گا۔ کسی رفیع الشان اور بلند نصب العین کے لیے جدوجہد کر کے اسے خود بھی ترفع حاصل ہو گا۔ لیکن اگر مقصد پست ہے' آئیڈیل پست ہے تو انسان خود بھی پستی کا مکین رہے گا۔ اس کی اپنی شخصیت بھی پستی ہی کی جانب مائل رہے گی۔ اس کی اپنی سیرت و کردار کی کسی اعلیٰ سطح پر تعمیر ممکن نہ ہو گی۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ جیسے کسی اونچی فصیل پر چڑھنے کے لیے

آپ کو ایک کمند دے دی جائے تو آپ کو پہلے وہ کمند پھینکنا ہوگی۔ اس کمند کے پھینکنے کا دار و مدار آپ کی قوتِ بازو پر ہے۔ آپ اسے جتنا اونچا پھینک سکیں گے اتنا ہی اونچا پھر آپ چڑھ بھی سکیں گے۔ اگرچہ پھر بھی چڑھنا آپ کو اپنی محنت سے ہوگا' لیکن اس کمند کو اونچا پھینک کر آپ نے اپنے اونچا چڑھنے کا امکان پیدا کر لیا۔ اور اگر کمند ہی کہیں نیچے اٹک کر رہ گئی تو ظاہر ہے کہ آپ اگر اس پر چڑھیں گے بھی تو صرف اتنی ہی بلندی تک پہنچ سکیں گے جہاں تک کہ وہ کمند جا سکی۔ چنانچہ اگر آپ کا آدرش' آپ کا نصب العین ارفع و بلند ہے تو آپ خود بھی رفعت اور بلندی تک رسائی حاصل کر سکیں گے اور اگر آدرش اور نصب العین ہی پست ہے تو اس سے ایک پست شخصیت اور پست سیرت و کردار ہی وجود میں آئے گا۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص نے صرف اپنی ذات ہی کو اپنا مقصود بنا لیا ہے' بقول جگر مراد آبادی ع ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!'' وہ اپنے ہی حریمِ ذات کے گرد چکر لگا رہا ہے تو یہ شخص انتہائی خود غرض اور کٹھور دل ہوگا۔ اس شخص کے اندر سے تمام محاسنِ اخلاق نکلتے چلے جائیں گے۔ اس سے بلند تر نصب العین ہوگا اس شخص کا جو اپنی قوم کو یا اپنے وطن کو اپنا آئیڈیل بنائے' اس کے لیے محنتیں کرے' اس کے لیے جدوجہد کرے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نسبتاً بلند تر نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے والا شخص خود بھی نسبتاً ایک بہتر شخصیت کا مالک ہوگا۔ اس میں اپنی قوم کے لیے ایثار اور قربانی کا مادہ ہوگا۔ وہ اپنی قوم کو اپنی ذات سے مقدم رکھے گا۔ اس کے سینے میں ایک وسعت ہوگی اور اس کی سوچ کے اندر بھی ایک وسعت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک بلند تر شخصیت ہے جو اس پہلے نصب العین یعنی صرف اپنی ذات یا شخص پرستی یا خود پرستی کے مقابلے میں قوم پرستی یا وطن پرستی کے نصب العین سے وجود میں آئے گی۔ اس سے بلند تر نصب العین انسان دوستی کا نصب العین ہے۔ یعنی قوم وطن کے امتیاز کے بغیر انسان کی خدمت' انسان سے محبت۔ یہ یقیناً پہلے دو سے اعلیٰ تر اور بلند تر نصب العین ہے۔ اس کی بنا پر ایک اعلیٰ تر اور عمدہ تر شخصیت وجود میں آئے گی۔

یزداں بکمند آور......

لیکن تمام آدرشوں' تمام نصب العینوں اور تمام آئیڈیلز میں بلند ترین نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ اس کو علامہ اقبال کہتے ہیں ع ''منزلِ ما کبریاست'' میری منزلِ مقصود اللہ کی ذات سے کم کہیں نہیں ہے۔ اسی کو علامہ نے تشبیہہ کے انداز میں وہی لفظ کمند استعمال کر کے یوں کہا ہے ع ''یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!'' انسان کے نصب العین اور ہدف ہونے کا مقام و مرتبہ سوائے خدا کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ وہی انسان کا مقصود ہو' وہی مطلوب ہو' وہی محبوب ہو۔ اب یہ بلند ترین نصب العین' بلند ترین آئیڈیل' بلند ترین آدرش اختیار کرنے کے نتیجے میں ایک اعلیٰ ترین شخصیت وجود میں آئے گی۔ جس کا آدرش خدا پرستی ہو' جس کا نصب العین رضائے الٰہی ہو' جس کا مطلوب و محبوب خود اللہ ہو اس کی اپنی شخصیت بتمام و کمال کیا ہوگی۔ اس کے لیے آپ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا نقشہ ذہن میں لائیے۔ اس نصب العین سے سینہ اتنا کشادہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کل مخلوق کے لیے جس کے اندر وسعت اور گنجائش ہو' نہ صرف انسان بلکہ حیوانات تک کے لیے شفقت و محبت ہو۔ **رحمة للعالمین** ہونے کی کیفیت درحقیقت اس شخص ہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو صحیح معنی میں خدا کا پرستار ہو' جس نے خدا کی بندگی کا حق ادا کر دیا ہو' خدا ہی اس کا مطلوب و محبوب ہو گیا ہو۔ وہ الفاظ یاد کیجیے کہ جو آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک پر اس دنیا سے رحلت کے وقت بار بار آئے: ''**اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی**'' یعنی بس ایک اللہ ہی مطلوب و مقصود ہے اور اب اُسی کی طرف مراجعت کے لیے طبیعت بے چین ہے۔ مطلوب کمزور اور ضعیف ہے تو طالب بھی کمزور اور ضعیف ہوگا۔ مطلوب کا مقام و مرتبہ اعلیٰ اور بلند ہو تو اس کے طالب کو بھی ترفع حاصل ہوتا چلا جائے گا۔

شرک: اللہ کی قدر کے فقدان کا نتیجہ

فرمایا: ﴿**مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ**﴾ ''انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا''۔ ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انسان کی یہ کمند ان چھوٹی چھوٹی چیزوں

میں الجھ کر کیوں رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ انسان خدا کے جمال وجلال کا کوئی اندازہ نہ کر پایا جیسا کہ اُسے کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ اللہ کے حسن و جمال کی کوئی جھلک دیکھ پاتا' اس کے مرتبہ کمال کا کہیں کسی انداز میں عُشرِ عشیر ہی کوئی تصور کر پاتا تو یہ دنیا و مافیہا اس کی نگاہوں میں ہیچ ہوگئی ہوتی۔ وہ نہ صرف یہ کہ ان میں سے کسی کو اپنا مقصود اور آئیڈیل نہ بناتا بلکہ واقعتاً اس کا مطلوبِ حقیقی' اس کا مقصودِ اصلی صرف ذاتِ باری تعالیٰ بن جاتی۔ یہ اگر ہوا ہے تو اس لیے ہوا ہے کہ انسان کی نگاہیں دنیا میں الجھی ہوئی ہیں۔ علامہ اقبال نے جو مکالمہ لکھا ہے عقاب اور چیونٹی کے درمیان اور اس میں عقاب سے یہ کہلوایا ہے کہ ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں!
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

اس کے مصداق انسان کی توجہات پستی کی طرف ہیں۔ انسان جو پستی کا مکین ہے اس نے ان پست اشیاء ہی کو اپنا مطلوب و مقصود بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ خدا کے جلال و جمال' اس کے کمال' اس کے حسن کا کوئی تصور نہ کر سکا۔ اس نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾﴾ اللہ بذاتہٖ قوی ہے' اللہ بذاتہٖ عزیز ہے۔ وہ القوی ہے اور العزیز ہے۔ اصل میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ شرک جب بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے فقدان یا اس کی کمی کے باعث ہوگا۔ اگر اللہ کو پہچان لیا جائے جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے تو شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کون ہے جو گھٹیا کو اعلیٰ کے مقابلے میں قبول کرے گا۔ چونکہ وہ اعلیٰ اس کے سامنے آیا نہیں' اس کا وہ کوئی تصور کر نہیں پایا' اُس کی کوئی جھلک اس نے دیکھی نہیں ہے' اس لیے وہ عاشق بنا پھرتا ہے اس ادنیٰ کا۔ اگر کہیں اُس اعلیٰ کی جھلک اُس نے دیکھ لی ہوتی تو یہ دنیا و مافیہا اس کے لیے ہیچ ہو جاتی۔

اب آپ ذرا اس کا تجزیہ کیجیے۔ جاہلیت قدیمہ کا شرک یہ تھا کہ خدا کے تصور اور خدا کی معرفت کی کمی کی وجہ سے انسان نے خدا کو اپنے ذہن کے پیمانوں سے ناپا۔ اس نے سمجھا کہ خدا ایک بڑا بادشاہ ہے' تو بادشاہ کے لیے بھی تو شہزادے شہزادیاں ہونی چاہئیں۔ بادشاہ کو بھی تو اولاد کی طلب ہوتی ہے کہ کوئی اس کا وارث ہو۔ لہٰذا اس کے لیے بیٹے یا بیٹیاں تجویز کر دیے گئے۔ پھر یہ کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی آخر کچھ اعیانِ مملکت اور نائبین سلطنت ہوتے ہیں' اس کی حکومت کا تخت انہی کے بل پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے لیے بھی انہوں نے کچھ نائبینِ سلطنت تجویز کر لیے اور ان کو بھی کچھ اختیارات دے دیے گئے کہ یہ فلاں کا دیوتا ہے اور یہ فلاں کی دیوی ہے۔ یہ آگ کا دیوتا ہے' یہ پانی کا دیوتا ہے اور یہ دولت کی دیوی ہے۔ اس طور سے خدائی اختیارات کی تقسیم کر دی گئی۔ یا یہ کہ بڑے سے بڑے انسان اور بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی کچھ ایسے مقربین بارگاہ اور مصاحبینِ خاص ہوتے ہیں جن کی بات وہ ٹالا نہیں کرتا۔ لہٰذا اللہ کے بھی کچھ ایسے دوست ہیں کہ ان کی بات وہ نہیں ٹال سکتا۔ اگر وہ سفارش کر دیں تو بس بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تصورات ہیں جو انسان نے خود کو اپنے پیمانوں پر ناپ کر قائم کر لیے ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ جو ایک مکالمہ علامہ اقبال نے ایک بُت تراش اور اس کے تراشے ہوئے بُت کے مابین پیش کیا ہے' اس میں بُت یہ کہتا ہے کہ تُو تو مجھے خدا بنانے چلا تھا اور بنایا کیا ہے؟ اپنے دو ہاتھ دیکھے تو میرے بھی دو ہاتھ بنا دیئے۔ تو نے مجھے اپنی ہی صورت پر' اپنی ہی شکل پر' ڈھال دیا ہے ؎

مرا بر صورتِ خویش آفریدی!
برونِ خویش تن آخر چہ دیدی؟

تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تیرے سامنے تو اپنا ہی وجود ہے۔ تو خدا کو جب انسان اپنے پیمانوں اور اپنے وجود کے مطابق ڈھال کر دیکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں شرک کا ایک انبار اور طومار وجود میں آتا ہے۔

اس وقت کا شرک بھی درحقیقت خدا کی معرفت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ خدا پرستی کی

بجائے وطن پرستی، قوم پرستی، خود پرستی، مفاد پرستی —— یہ ساری چیزیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ انسان اپنے خول سے باہر نکل کر اللہ کے حسن و جمال کا کوئی مشاہدہ نہ کر پایا۔ اگر کہیں انسان اس کی کوئی جھلک دیکھ پاتا تو یہ تمام چیزیں ہیچ ہو جاتیں اور ان میں سے کسی کو اس کے مطلوب و مقصود ہونے کی حیثیت حاصل نہ رہتی اور ''منزلِ ما کبریاست'' کے مصداق ذاتِ باری تعالیٰ ہی اس کا مطلوب و محبوب اور منتہائے مقصود ہوتی۔ اب اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہ یہی کہ اللہ کی معرفت کی روشنی کو عام کیا جائے، خدا کی پہچان لوگوں میں عام کی جائے۔ اگر انسان خدا کو پہچان لے اور اللہ کی قدر کسی درجے میں کر سکے جیسا کہ اس کی قدر کا حق ہے، اور اگر اس کی قوتوں، اس کی توانائیوں، اس کے اختیارات، اس کے صفاتِ کمال اور اس کے حسن و جمال کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی کر پائے تو ممکن نہیں ہے کہ پھر وہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی طرف متوجہ ہو اور کسی اور کو اپنے قلب کے سنگھاسن پر محبوب و مطلوب کا درجہ دے کر بٹھائے۔ تو یہ ہے شرک کا اصل سبب اور یہ ہے اس کے سدباب کی واحد کوشش۔ یہ ہے وہ توحید اور شرک کا فلسفہ کہ جو ان دو آیات میں انتہائی جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔

نبوت و رسالت سے متعلق ایک اہم حقیقت کا بیان

سورۃ الحج کے آخری رکوع کے جزوِ اوّل کی تیسری آیت میں نبوت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ لفظ ''اِصْطَفٰى'' صفی سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چن لینا، پسند کر لینا، to choose۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ چن لیتا ہے، پسند فرما لیتا ہے۔ آگے چلیے! رُسُل جمع ہے رسول کی۔ اور اَرْسَلَ - يُرْسِلُ - اِرْسَالًا کے معنی ہیں بھیجنا۔ تو رسول کے معنی ہوئے بھیجا ہوا، فرستادہ، پیغامبر، سفیر، ایلچی۔ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی!'' یہ درحقیقت سلسلۂ رسالت یا سلسلۂ وحی کی دو کڑیاں ہیں کہ جن کو یہاں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوت و رسالت کی اصل غرض و غایت

ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ نبوت و رسالت یا وحی کی اصل غرض و غایت کیا ہے! یہی کہ نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغامِ ہدایت پہنچ جائے۔ انسان روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے؟ تجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے؟ ان کی اس دلیل کو ختم کرنے اور اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے کے لیے رسول بھیجے گئے اور وحی و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا گیا۔ اس ضمن میں یہ دو الفاظ اپنے ذہن میں ٹانک لیجیے: قطعِ عذر اور اتمامِ حجت۔ یہ ہے مقصد نبوت کا، رسالت کا، وحی کا اور انزالِ کتب کا۔ اس مضمون کے بیان میں سورۃ النساء کی یہ آیت بہت اہم ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ ''رسولوں کو ہم نے بھیجا مبشر اور نذیر بنا کر، تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل باقی نہ رہے''۔ ان کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی عذر نہ رہے۔ آپ غور کیجیے ایک طرف اللہ کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اتنی لطیف ہے کہ لفظ ''لطیف'' بھی کسی درجے میں کثافت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ادھر انسان ہے پستیوں کا مکین، اسفل سافلین، ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝﴾ چنانچہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے حکمتِ خداوندی نے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ درمیان میں دو کڑیاں (links) اختیار کی گئیں۔ پہلا لنک، پہلی کڑی ہے رسولِ مَلک، یعنی فرشتوں میں سے ایک ایلچی اور پیغامبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتہ نورانی مخلوق ہے۔ اپنی اس نورانیت کی وجہ سے یہ مخلوقِ خدا سے منجملہ ایک قرب رکھتی ہے۔ فرشتہ کلام اللہ کی تلقی کرتا ہے اللہ سے۔ وہ پیغام حاصل کرتا ہے اللہ سے اور اسے جا پہنچاتا ہے انسانوں میں سے ایک منتخب مَرد کو، ایک چنے ہوئے فرد کو جو اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے فرشتہ اور انسان دونوں ایک دوسرے سے قرب رکھتے ہیں اور اس بناء پر ان کے مابین ایک اتصال ممکن ہے۔ چنانچہ رسولِ مَلک نے وہ پیغام

اللہ سے حاصل کر کے رسولِ بشر تک پہنچایا اور اب رسولِ بشر کی یہ ذمہ داری ہوئی کہ وہ پہنچائے اس پیغام کو اپنے ابنائے نوع تک۔ اس کا پہنچانا قولاً بھی ہوگا اور عملاً بھی ہوگا۔ وہ زبان سے بھی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے گا' انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دے گا اور عمل سے اِس کا نمونہ بھی پیش کر کے حجت قائم کر دے گا کہ یہ دعوت اور یہ پیغام محض کوئی نظری یا خیالی (theoretical) شے نہیں ہے' یہ کوئی ناقابلِ عمل پیغام نہیں ہے' بلکہ اس کا ایک عملی نمونہ بھی موجود ہے۔ اسی لیے قرآن مجید اس نکتے پر خصوصی زور دیتا ہے کہ: ﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾۔ انبیاء ورسل کی پوری شخصیت نوعِ انسانی کے لیے ایک اُسوہ اور نمونہ ہوتی ہے کہ اپنے تمام بشری تقاضوں کے باوصف وہ وحی الٰہی کی اس تعلیم پر عمل کر کے دکھا دیں اور اس کا ایک عملی نمونہ پیش کر دیں' تاکہ لوگوں کے پاس اپنی بے عملی اور غلط روی کے لیے کوئی دلیل اور کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ ہے نبوت ورسالت کی اصل غرض وغایت!

ایمان بالملائکہ کی خصوصی اہمیت

اس آیت کے حوالے سے یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ایمان بالملائکہ کی اہمیت کیا ہے! ورنہ بظاہر تو اس بات پر ایک تعجب سا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایمان بالملائکہ پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ آیۂ بر میں' جو ہمارے اس منتخب نصاب کا دوسرا سبق تھا' ملائکہ پر ایمان کا ذکر موجود تھا: ﴿وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ﴾ اسی طرح حدیث جبریل کو ذہن میں لائیے۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ ''اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِیۡمَانِ'' تو نبی اکرم ﷺ کی جانب سے جواب سے یہی جواب دیا گیا کہ ((اَنۡ تُؤۡمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ...... الی الاخر)) معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے بغیر وحی کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے کچھ فلاسفۂ قدیم نے اور انہی کے اتباع میں بہت سے دانشورانِ جدید نے بھی ۔ اس دور میں سرسید احمد خاں کو اس طبقۂ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ملائکہ کے وجود کا صریح انکار کیا کہ ملائکہ کا کوئی صاحبِ تشخص وجود نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی کی توجیہہ کیا ہے! بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ وحی کا چشمہ تو قلبِ نبی ﷺ سے ہی پھوٹتا ہے۔ وحی کو نبی تک لانے والی خارج میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وحی کو لانے والے خارجی عناصر کے اس انکارِ مطلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کا مسئلہ ایک چیستاں بن گیا۔ وحی کی اصل حقیقت پھر کیا ہے؟ سرسید احمد خاں نے ایک شعر میں اپنے اس گمراہ کن خیال کو بڑے شدّ ومد کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اگرچہ مصرع ثانی میں معشوق کا لفظ دو معنی دے رہا ہے' یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے مراد ان کی ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ بہرحال یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انہوں نے بیک بینی و دو گوش اس معاملے سے نکال باہر کیا۔ قرآن مجید کا یہ مقام اس معاملے کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔

ذہن میں رکھیے کہ یہ مضمون سورۃ التکویر میں بھی آیا ہے اور اس کا اعادہ سورۃ النجم میں بھی ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل ملکی حالت میں دوبار دیکھا ہے۔ اس ملاقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ کسی روایت میں اگر راویوں کی کڑیاں متصل نہ ہوں' ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو وہ روایت ناقابلِ اعتماد ہو جائے گی۔ قرآن بھی ایک روایت ہے' یہ اللہ کی حدیث ہے جو بروایت جبریل علیہ السلام پہنچی محمد ﷺ تک اور پھر نبی اکرم ﷺ نے اسے پہنچایا انسانوں تک۔ اس اہم اور نازک معاملے میں روایت کی ان کڑیوں کا اتصال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سورۃ التکویر میں حضور ﷺ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا ہے: ﴿وَلَقَدۡ رَاٰہُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲۳﴾﴾ کہ ''حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا افقِ مبین پر! اسی طور سے

سورۃ النجم میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝١٣ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝١٤﴾ کہ حضرت جبرئیل کو اصل ملکی صورت میں آنحضورﷺ نے دوسری بار شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی اس ملاقات کو دو مقامات پر اس قدر صراحت کے ساتھ اسی لیے بیان کیا ہے کہ یہ وحی کی دو کڑیاں ہیں۔ رسولِ مَلک نے اللہ تعالیٰ سے اس پیغام کو حاصل کر کے پہنچایا رسولِ بشر تک اور رسولِ بشر نے اس کو پہنچا دیا خلقِ خدا تک۔ یہ گویا کہ ایمان بالرسالت کی ایک اہم بحث تھی جو اس مقام پر ایک آیت میں آئی!

اب چوتھی آیت میں عقیدۂ معاد اور عقیدۂ آخرت کا بیان ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ﴾ ''وہ (اللہ تعالیٰ) جانتا ہے کہ جو کچھ کہ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے''۔ لیکن یہ جاننا کس لیے ہے؟ جواب بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝٧٦﴾ ''بالآخر سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے''۔ تمام معاملات آخری فیصلے کے لیے اس کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ ہر شخص کو جواب دہی کے لیے وہاں حاضر ہونا ہوگا۔

یہاں ایک آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا گویا لبِّ لباب اور خلاصہ سامنے لے آیا گیا ہے۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ (سورۃ الحج) کے پہلے رکوع میں چونکہ انتہائی وضاحت کے ساتھ آخرت کا بیان ہوا ہے، لہٰذا یہاں آخری رکوع میں اس کی طرف ایک اجمالی اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ چار آیات ہیں جن کا آغاز ''يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ'' کے خطاب سے ہوا ہے۔ ان میں جو اہم مضامین آئے ہیں ان میں شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، شرک کا اصل سبب ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ﴾، شرک کا انسان کی سیرت وکردار پر یہ اثر کہ پھر وہ ایک پست شخصیت کا مالک ہو کر رہ جاتا ہے اور توحید کا اصل حاصل کہ اللہ کے پجاری اور اللہ کے پرستار خود اپنی ذات میں بھی ترفع حاصل کرتے ہیں، پھر نبوت ورسالت کی اہم بحث میں سلسلۂ وحی کی دو کڑیوں رسولِ مَلک اور رسولِ بشر کا ذکر اور اس کے بعد عقیدۂ آخرت کا بیان سب شامل ہیں۔

اہلِ ایمان سے دین کے تقاضے

اب اگلی آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان حقائق کو مان چکے ہوں، ان پر ایمان لا چکے ہوں۔ چنانچہ آغاز ہو رہا ہے ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ سے۔ ''اے اہل ایمان!'' یعنی اے وہ لوگو جنہوں نے مان لیا توحید کو، جنہوں نے تسلیم کر لیا آخرت کو، جو ایمان لے آئے رسالت پر، آؤ کہ تمہیں بتایا جائے کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے! دین تم سے کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے، تمہاری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں؟— آپ دیکھیں گے کہ اس مقام پر دو آیتوں میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ اور پے بہ پے فعل امر کا استعمال ہے کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو! یہ ہیں دین کے عملی تقاضے! فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝٧٧ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝٧٨﴾

''اے اہل ایمان! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی پرستش کرو، اور نیک کام کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے، اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ اُس نے تمہارا نام رکھا مسلمان، اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی، تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ! (اللہ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ) وہ تمہارا

حامی ہے (مددگار ہے، پشت پناہ ہے۔) تو کیا ہی اچھا ہے وہ ساتھی اور مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ اور حمایتی!''۔

پہلا تقاضا: ارکانِ اسلام کی پابندی

ان دو آیات پر غور کیجیے۔ پہلی آیت میں چار اوامر وارد ہوئے اور ان میں ایک بڑی خوبصورت معنوی ترتیب نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ سمجھنے کے لیے ایک ایسی سیڑھی کا نقشہ اپنے ذہن میں لایئے جس کے چار قدمچے (steps) ہوں۔ دیکھئے، کسی بھی مدعی ایمان سے دین کا پہلا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ ارکانِ اسلام کی، شعائرِ دین کی اور فرائض کی پابندی کرے۔ ان میں اوّلین فریضہ، کہ جس کو اسلام اور کفر میں امتیاز قرار دیا گیا ہے ——— اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْکُفْرِ وَالْاِسْلَامِ الصَّلَاۃُ ——— نماز ہے۔ یہ **عماد الدین**، یعنی دین کا ستون ہے۔ ارکانِ اسلام میں سے رکنِ رکین یہی نماز ہے۔ اس آیت میں نماز کے دو ارکان یعنی رکوع اور سجود کے حوالے سے مراد درحقیقت نماز ہے اور یہ نماز گویا نمائندگی ہوگی تمام ارکانِ اسلام کی۔ اس لیے کہ یہ ان میں سرفہرست ہے۔ لہٰذا مطالباتِ دینی کی پہلی سیڑھی مشتمل ہے ارکانِ اسلام کی پابندی پر۔

دوسرا تقاضا: عبادتِ ربّ

اب دوسری سیڑھی کی طرف قدم بڑھاؤ ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ صرف نماز روزہ ہی مطلوب نہیں ہے، ربّ کی پرستش، اس کی بندگی اور اس کی اطاعتِ کلّی پوری زندگی میں درکار ہے۔ یہ اطاعت بلا چون و چرا ہونی چاہیے اور بلا استثناء بھی! زندگی کو حصوں اور اجزاء میں تقسیم نہ کر دیا گیا ہو کہ ایک حصے میں اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور زندگی کے بعض گوشے اس اطاعت سے یکسر خالی ہوں۔ احکامِ خداوندی کی تفریق نہ ہو جائے کہ کوئی سر آنکھوں پر اور کوئی پاؤں تلے! وہ بندگی اور اطاعتِ کلّی مطلوب ہے جو محبت خداوندی کے جذبے سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ دوسری سیڑھی ہے مطالباتِ دین کی۔ اور درحقیقت ارکانِ اسلام سے بھی مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے اندر یہ صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اپنے ربّ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال سکے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج سب اسی لیے ہیں کہ انسان پوری زندگی بندگیٔ ربّ کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے! یہ دوسرا تقاضا ہوا۔

تیسرا تقاضا: بھلائی کے کام اور خدمتِ خلق

اس سلسلے کی تیسری سیڑھی کا بیان اس آیۂ مبارکہ میں ﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے کہ نیک کام کرو، بھلے کام کرو۔ یہاں ظاہر بات ہے کہ خدمتِ خلق کے کام مراد ہیں کہ انسان کا وجود اپنے ہم نوع افراد کے لیے، پوری نوعِ انسانی کے لیے سراپا خیر کا موجب اور سبب بن جائے۔ اس کے بھی دو درجے ذہن میں رکھئے، ایک درجہ وہ ہے جسے آپ خدمتِ خلق کا بنیادی تصور کہہ سکتے ہیں اور جس سے سب لوگ واقف ہیں، یعنی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، اگر کوئی لباس سے محروم ہے تو اسے کپڑے پہنائے جائیں، کوئی بیمار ہے تو اس کی دوا دارو کا اہتمام کر دیا جائے، کسی راہ چلتے کو راستہ بتا دیا جائے۔ اسی طرح یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور محتاجوں کی خبر گیری اور سرپرستی کا شمار بھی خدمتِ خلق کے کاموں میں ہوگا۔ آیۂ بر میں یہ بحث ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ﴾

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

لیکن غور کیجیے گا۔ خدمتِ خلق ہی کی ایک بلند تر سطح اور بھی ہے، وہ بلند تر سطح ہے بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانا، وہ کہ جن کی زندگی کا رخ غلط ہو گیا ہے، جو ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں، جو اپنی بے بصیرتی کے باعث آگ کے الاؤ میں کود جانا چاہتے ہیں، ان کو سیدھی راہ پر لانا، خلقِ خدا کو راہِ ہدایت کی طرف دعوت دینا، اس سے بڑا خدمتِ خلق کا معاملہ اور کوئی نہیں! اس لیے کہ موٹی سی بات ہے کہ اگر کسی کو غذا فراہم کر کے اس کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا ہوا، اگر وہ ہمہ تن آگ کے حوالے ہونے والا ہو اور آپ کو اس کی فکر نہ ہو! یہ کوئی ایسا بڑا خدمتِ خلق کا کام تو نہ ہوا۔ اگر کسی کی کوئی وقتی سی دنیاوی ضرورت آپ نے پوری کر بھی

دی دراں حالیکہ آپ کو یقین ہے‘ اگر واقعتاً آپ کی آنکھیں کھل چکی ہیں کہ وہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ کیا بھلائی کی! جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جس میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور مَیں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اور تمہارے کپڑے گھسیٹ گھسیٹ کر تمہیں اس سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی وارد ہوا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾

’’اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے!‘‘ اور حضور ﷺ کا وہ طرزِ عمل کہ ((یَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ)) ’’اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے‘‘۔ اور ((یَا صَفِیَّةُ عَمَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ)) ’’اے اللہ کے رسول (ﷺ) کی پھوپھی صفیہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے‘‘ کہ آپؐ اپنے گھر کے ایک ایک فرد کو گویا جہنم کی آگ سے خبردار فرماتے تھے اور اس سے خود کو بچانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ یہ خدمتِ خلق کی بلند ترین منزل ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر جب تک وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں خدمتِ خلق کی وہ ابتدائی منزل بتمام وکمال موجود تھی۔ یتیموں کی خبرگیری ہے‘ مسکینوں کی خدمت ہے‘ مسافروں کی مہمان نوازی ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں حضور ﷺ کی سیرت میں موجود تھیں۔ لیکن جب آپؐ کے پاس وہ ’’اَلْحَق‘‘ آ گیا‘ ہدایتِ خداوندی نازل ہوگئی‘ جب آپؐ پر حقائق منکشف کر دیے گئے‘ جب عالمِ آخرت کے اسرار آپؐ کی نگاہوں پر روشن کر دیے گئے‘ آپ کی ساری مساعی‘ ساری تگ و دَو‘ ساری دوڑ دھوپ اور خدمتِ خلق کا وہ پورا جذبہ مرتکز ہو گیا اسی پر کہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دیں‘ راہِ ہدایت کی طرف بلائیں‘ نیند کے ماتوں کو جگائیں‘ جو لوگ مدہوش ہیں اور ہلاکت و بربادی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کریں۔ یہ چار باتیں جو درحقیقت منبر کی تین سیڑھیوں کے مشابہ ہیں‘ بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ’’لَعَلَّ‘‘ کے اصل معنی ہوتے ہیں ’’شاید‘‘ ترجمہ یوں ہوگا ’’شاید کہ تم فلاح پاؤ‘‘ اور یہ ’’شاید‘‘ کا لفظ جب شاہانہ انداز میں کلامِ الٰہی میں آتا ہے تو اس میں حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے‘ جیسے کوئی بادشاہ اگر کسی سے کہے کہ اگر تم یہ کرو تو شاید ہم تمہارے ساتھ یہ معاملہ کریں‘ تو درحقیقت یہاں یہ ’’شاید‘‘ ایک مکمل وعدے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ تو فرمایا: ’’لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ‘‘ یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح سے ہمکنار ہو گے۔ یہ کرو گے تو کامیابی حاصل کر سکو گے۔

’’اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!‘‘

معلوم ہوا کہ اب ہم پھر اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا سورۃ العصر اپنے جملہ مضامین کے ساتھ پھر ہمارے سامنے آ گئی۔ اس لیے کہ وہاں نجات کی شرطِ اوّل تھی ایمان‘ یہاں خطاب ہوا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’اے اہلِ ایمان!‘‘ کے الفاظ سے۔ وہاں ایمان کے فوراً بعد ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کی شرط مذکور تھی۔ یہاں اسی عملِ صالح نے ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ﴾ کے الفاظ میں چار اوامر کی شکل اختیار کر لی۔ ’’رکوع کرو‘ سجدہ کرو‘ بندگی کرو اپنے ربّ کی اور تمہارا عمل خیر پر مبنی ہو جائے‘‘۔ البتہ ’’وَافْعَلُوا الْخَیْرَ‘‘ کو اس کے وسیع تر مفہوم میں لیجیے جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ)) کہ لوگوں میں بہتر وہی ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا ہو‘ جس سے لوگوں کو نفع پہنچ رہا ہو۔ اب ظاہر بات ہے کہ نفع صرف دنیا کا نفع ہی تو نہیں ہے۔ یہ نفع کا نہایت محدود تصور ہے اور اگر فی الواقع آنکھیں کھل گئی ہوں‘ حقیقت منکشف ہو گئی ہو‘ آخرت کا علم انسان کو حاصل ہو گیا ہو‘ تو اب ’’نفع‘‘ کا مفہوم بدل جائے گا۔ اب انسان کو نظر آئے گا کہ اصل نفع تو آخرت کا نفع ہے۔ اصل جیت وہاں کی جیت اور اصل ہار وہاں کی ہار ہے۔ سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے: ﴿ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ ’’وہ

ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن‘‘۔ جو اُس روز نفع میں رہا وہ حقیقتاً نفع میں رہا اور جو اُس روز گھاٹے میں قرار دیا گیا وہی ہے اصل میں گھاٹا پانے والا!

فلاح کا دار و مدار دینی فرائض کی ادائیگی پر ہے!

اس آیۂ مبارکہ پر پھر اپنی توجہ مرکوز کیجیے!

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾

’’اے اہلِ ایمان! رکوع کرو‘ سجدہ کرو‘ اپنے ربّ کی بندگی کرو (اُس کی اطاعتِ کلی پر کاربند ہو جاؤ‘ اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر) اور بھلے کام کرو‘ (نیکیاں کرو‘ خلقِ خدا کی خدمت کرو) یہ سب کام کرو گے تو فلاح پاؤ گے!‘‘

آپ غور کیجیے کہ اگر صرف دعوائے ایمان سے فلاح اور کامیابی کا حصول یقینی ہو جائے تو کیا یہ سارا کلام نعوذ باللہ من ذٰلک مہمل نہیں قرار پائے گا؟ یہ بے معنی بات ہو گی۔ یہ منطق کی اصطلاح میں تحصیلِ حاصل قرار پائے گا۔ جو چیز محض دعوائے ایمان سے یا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے خود بخود حاصل ہو جائے اس کے لیے اتنا کھکھیڑ مول لینا‘ اتنی محنت اور مشقت کرنا سعیٔ لاحاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ رکوع و سجود‘ بندگیٔ ربّ‘ پوری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعتِ کلی اور خدمتِ خلق پر کمربستہ ہو جانا گویا یہ سب چیزیں اضافی قرار پائیں گے! لیکن قرآن حکیم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ العصر میں یہ بات وضاحت سے سامنے آئی تھی کہ نجات کی شرائط چار ہیں!

﴿وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾﴾

چوتھا تقاضا: جہاد فی سبیل اللہ

ایمان اور عمل صالح کی حد تک بحث تو سورۃ الحج کی اس ایک آیت میں مکمل ہو گئی جس کا مطالعہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے قائم مقام کے طور پر‘ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے‘ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کے حوالے سے اب اصطلاح آ رہی ہے یہاں جہاد کی۔ چنانچہ دوسری جو اس رکوع کی آخری آیت ہے‘ پوری کی پوری جہاد ہی کے موضوع پر ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ﴾

’’اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کا حق ہے‘‘۔ آپ دیکھیں گے کہ اس رکوع کے پہلے اور دوسرے حصے کے مابین مضامین کے اعتبار سے بڑا گہرا ربط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے ہمارے اس منتخب نصاب میں اب جہاد ہی کا موضوع چل رہا تھا لیکن اس آخری آیت کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پورے رکوع کا مضمون سامنے آ جائے۔

رکوع کے دونوں حصوں کا تقابل کیجیے! اوپر لفظ آیا تھا: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ﴾ کہ انہوں نے خدا کو نہ پہچانا جیسے کہ پہچاننا چاہیے تھا۔ وہ اللہ کے مقام و مرتبہ اور اُس کی صفاتِ جمال و کمال کا کوئی اندازہ نہ کر پائے جیسا کہ اس کے اندازے کا حق تھا۔ وہی اسلوب یہاں آ رہا ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ﴾۔ یہ دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: (۱) خدا کی معرفت جیسا کہ اس کا حق ہے‘ اور (۲) خدا کے لیے جہاد‘ کوشش‘ جدوجہد اور محنت جیسا کہ اس کا حق ہے۔ پہلی چیز ایمان کا لبِّ لباب اور ایمان کا اصل حاصل ہے۔ انسان کی نظری و فکری و عملی قوتوں کی معراج ہے اللہ کی معرفت! اور انسان کا قوائے عملیہ کا جو بہترین ہدف اور ان کا بہترین مصرف ہے وہ ہے جہاد فی اللہ‘ یعنی اللہ کے لیے جہاد۔ درحقیقت ’’فی اللہ‘‘ سے مراد بھی کم و بیش وہی ہے جو ’’فی سبیل اللہ‘‘ سے ہے‘ جس پر مفصل گفتگو پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ آیت کے الفاظ پر توجہ کو جمائیے! ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ﴾ اور محنتیں کرو‘ کوششیں کرو‘ جدوجہد کرو‘ لگاؤ اس راہ میں اپنی جانیں اور اپنے مال اور کھپاؤ اپنی جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں اور صرف کرو اپنے اوقات اس طور سے اور اس شان سے کہ جس شان سے اللہ کے لیے محنت کرنے کا حق ہے۔

یہاں ذہن میں رکھیے کہ انسان محنتیں کرتا ہے‘ مشقتیں بھی کرتا ہے‘ لیکن یہ مسئلہ کہ

اس کی محنت اور مشقت پر کس کا کتنا حق ہے‘ اس کی صحیح تعیین ہی پر دار و مدار ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا۔ ہم میں سے اکثر لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو گویا کہ ہمہ تن کھپا دیتے (invest کر دیتے) ہیں اپنی اولاد پر۔ بلکہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کے معاملے میں یہ بات شاید غلط نہ ہوگی جو ایک صاحب نے بڑے عجیب پیرائے میں ایک زمانے میں مجھ سے کہی تھی کہ میں تو اپنی بیوی بچوں کا ملازم ہوں کپڑے اور روٹی پر! میری ساری محنت صرف ہوتی ہو کمانے پر۔ اور اس کمائی کا مصرف کیا ہے؟ میرے یہ گھر والے‘ ان کی ضروریات‘ ان کا پیٹ پالنا‘ ان کا تن ڈھانپنا اور بس! یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ اگر تجزیہ کیا جائے تو ننانوے فیصد لوگوں کی سعی و جہد‘ ان کی بھاگ دوڑ‘ ان کی محنت کا اصل حاصل اس کے سوا کچھ نہیں! سوال یہ ہے کہ انسان اگر اپنے اہل و عیال کے لیے محنتیں اور مشقتیں کر رہا ہے تو وہ اہل و عیال آخر اس کو کیا repay کر سکیں گے؟ اس کی اس محنت اور جدوجہد کی کیا قیمت ادا کر سکیں گے؟ اسے اس کا کیا بدلہ دے سکیں گے؟ اکثر و بیشتر تو وہی اولاد انسان کے بڑھاپے کے وقت اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ الفاظ بھی زبان سے نکلتے ہیں کہ ابا جان! آپ پرانے زمانے کے لوگ ہیں‘ آپ کو کیا معلوم کہ جدید زمانے کے تقاضے کیا ہیں! اس وقت جس طرح کلیجہ اندر سے کٹتا ہے کہ یہ ہیں وہ کہ جن پر ہم نے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا تھا‘ لگا دیا تھا اور کھپا دیا تھا! چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ تم سوچو کہ تمہاری محنت و مشقت اور تمہاری سعی و جہد کا اصل حق دار کون ہے؟ کیا وہی نہیں جو تمہارا خالق ہے‘ تمہارا مالک ہے‘ تمہارا پروردگار ہے‘ تمہارا پالن ہار ہے اور تمہارا رازق ہے! اگر واقعتاً تم نے اسے پہچان لیا ہے‘ اگر یہ تمہارا اقرار لسانی محض ایک عقیدہ نہیں ہے جو زبان پر ہو‘ بلکہ اس کی حقیقت بھی کسی درجے میں تمہیں حاصل ہو چکی ہے اور تمہارے دل و دماغ اس حقیقت سے منور ہو چکے ہیں تو اس کا تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلنا چاہیے‘ وہ یہ کہ تمہاری سعی و جہد کا اوّلین ہدف اور تمہاری قوتوں اور توانائیوں کا اوّلین مصرف اللہ اور اس کے دین کی سربلندی قرار پانا چاہیے۔ اور تمہاری قوتوں اور صلاحیتوں کا بہتر اور بیشتر حصہ لگنا چاہیے اور کھپنا چاہیے اللہ کے لیے! اسی کا نام جہاد فی اللہ یا جہاد فی سبیل اللہ! اس طور سے جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ یہ نہ ہو کہ معمولی سی کوشش یا تھوڑی سی محنت کر کے اور ذرا سا ایثار یا تھوڑا سا وقت لگا کر یا کچھ تھوڑا سا کہیں چندہ دے کر انسان اپنے دل کو مطمئن کر بیٹھے کہ میں نے حق ادا کر دیا‘ میں نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی‘ اللہ کے لیے جتنا کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نے کر دیا! یہاں ”حَقَّ جِهَادِهٖ“ کے الفاظ بہت اہم ہیں اور ان کے ذریعے اس عمل کو جس شدّ و مد کے ساتھ اور جس وسعت کے ساتھ ہونا چاہیے اور زندگی میں اس کو جس درجے اہمیت‘ جو مقام اور مرتبہ ملنا چاہیے‘ اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ابھی یہ مضمون جاری رہے گا — جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یعنی شہادت علی الناس درحقیقت اس آخری آیت کا اصل مضمون ہے‘ جس کے پیشِ نظر اس مقام کو منتخب نصاب کے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔

مطالباتِ دین کا خلاصہ

سورۃ الحج کے آخری رکوع کا جزوِ ثانی جو دعوتِ عمل پر مشتمل ہے‘ یا جس میں یوں کہنا چاہیے کہ ایمان کے عملی مقتضیات کا بیان ہوا ہے کہ ایک بندۂ مؤمن سے اس کا دین کیا تقاضا کرتا ہے‘ دو آیات پر مشتمل ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾﴾

”اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے ربّ کی اور بھلے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم

ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کے طریقے پر۔ اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان' پہلے بھی اور اس میں بھی' تاکہ ہو جائیں رسول (ﷺ) گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ۔ وہی ہے تمہارا پشت پناہ۔ تو کیا ہی اچھا ہے پشت پناہ اور کیا ہی عمدہ ہے مددگار!''

یہ دو آیات ہیں جن میں ایمان کے مقتضیات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ پہلی آیت نسبتاً چھوٹی ہے' دوسری طویل' بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ ان آیات میں' جیسا کہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا' پے بہ پے فعل امر وارد ہوئے ہیں کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو۔ حکمت قرآنی کا یہ اصول پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام کی دعوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' ایک ہے دعوتِ ایمان جو عام ہے پوری نوعِ انسانی کے لیے' ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے اور دوسری ہے دعوتِ عمل۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے مخاطب صرف وہی ہو سکتے ہیں کہ جو ایمان کا اقرار کر چکے ہوں' جو دعویٰ کرتے ہوں اللہ کو ماننے کا' آخرت کو ماننے کا اور نبوت و رسالت کو ماننے کا۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ایمان کے ان عملی تقاضوں کو پورا کرو! اس ضمن میں یہاں جو چند الفاظ وارد ہوئے ہیں اگر نگاہ کو صرف ان کے ظاہر تک محدود نہ رکھا جائے' بلکہ کسی قدر گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے' تو مطالباتِ دین اور دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں ایک بڑا عمدہ نقشہ سامنے آتا ہے جسے اگر ایک سیڑھی سے مشابہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جیسے ایک منبر کے قدمچے (steps) ہوتے ہیں جن پر قدم رکھ کر انسان درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا ہے' اسی طرح مقتضیاتِ دین یا عملی کے عملی مطالبات کا تدریجاً اور سلسلہ وار بیان ان دو آیتوں میں آیا ہے۔

پہلی سیڑھی: ارکانِ اسلام

فرمایا: ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ ''رکوع کرو اور سجدہ کرو!'' قرآن مجید میں اکثر و بیشتر آپ دیکھیں گے کہ نماز کے مختلف ارکان کا ذکر ہوتا ہے' لیکن ان سے نماز مراد لی جاتی ہے۔ جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا گیا: ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ ''کھڑے رہا کرو رات کو سوائے اس کے کچھ حصے کے''۔ اب ظاہر بات ہے کہ کھڑے ہونے سے یہاں نماز میں کھڑے ہونا مراد ہے۔ اسی طرح سورۃ الدھر کی آیت ہے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝﴾ ''اور رات کے ایک حصے میں اللہ کے سامنے سربسجود رہا کرو اور تسبیح کیا کرو!'' یہاں تسبیح اور سجدہ سے مراد درحقیقت نماز ہی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی اس زیرِ نظر آیۂ مبارکہ میں بھی رکوع اور سجود سے مراد نماز ہے۔ اور نماز درحقیقت ارکانِ اسلام میں رکن رکین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ارکانِ اسلام میں سے پہلا رکن کلمۂ شہادت ہے' لیکن وہ آپ سے آپ یہاں گویا understood ہے' اس لیے کہ جب گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ سے تو سیدھی سی بات ہے کہ وہی لوگ یہاں مخاطب ہیں جو کلمۂ شہادت ادا کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رکن بلا شبہ نماز ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))

''کفر و شرک اور بندے کے درمیان نماز کا معاملہ حائل ہے۔''

لہٰذا اوّلاً اسی کا حوالہ دیا گیا کہ نماز قائم کرو۔ گویا نماز کی حیثیت تمام ارکانِ اسلام میں نمائندہ رکن کی ہے اور اس کے ذیل میں زکوٰۃ' روزہ اور حج آپ سے آپ مندرج ہیں' خواہ لفظاً وہ مذکور نہ ہوں۔ یہ حقیقت اگلی آیت کے آخر میں جا کر کھل جائے گی کہ یہاں رکوع و سجود سے مراد صرف نماز نہیں بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں۔ بہرحال یہ بات بالکل منطقی ہے اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ جو شخص ایمان کا اقرار کرتا ہے اُس پر سب سے پہلی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کی پابندی کرے۔ یہ پہلی سیڑھی ہے۔ اس پر قدم جماؤ تب دوسری سیڑھی کی طرف بڑھو!

دوسری سیڑھی: بندگیٔ ربّ

وہ دوسری سیڑھی کیا ہے: ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ ''اپنے ربّ کی بندگی کرو!'' یعنی اس کے عبد اور غلام بن کر زندگی بسر کرو! اس (تعالیٰ) کو اپنا آقا سمجھو اور اپنے آپ کو

اس کا مملوک جانو! اپنے کل وجود کا مالک اسی کو سمجھو اور اپنی پسند و ناپسند‘ اپنی چاہت‘ اپنی مرضی‘ ان سب سے اس کی اطاعت کے حق میں دستبردار ہو جاؤ! یہ اطاعت تمہاری پوری زندگی پر حاوی ہونی چاہیے‘ بغیر اس کے کہ اُس کے کسی جزو کو اُس سے مستثنیٰ کیا گیا ہو! اسی کی مرضی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالو! اور یہ پورا طرزِ عمل اختیار کرو اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر! اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے ایک سے زائد مقامات پر عبادت کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے۔ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج جنہیں ہم عبادات کہتے ہیں‘ سب اصلاً اسی ہمہ گیر عبادت کے لیے مطلوب ہیں۔ یہ اس عبادتِ عظیم کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے فرض کیے گیے ہیں۔ نسیان اور غفلت کا علاج نماز سے کیا گیا۔ اپنے نفس کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے روزہ عطا کیا گیا۔ مال کی محبت کی گرفت دل سے کم کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی۔ اور ان تمام مقاصد کو پورا کرنے والی ایک جامع اور عظیم عبادت حج کی شکل میں تجویز کی گئی۔ لیکن غور کیجیے کہ ان سب کا مقصد یہی تو ہے کہ بندگیٔ ربّ کا تقاضا پورا کرنے میں جو رکاوٹیں اور موانع ہیں انسان کے اندر ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ارکانِ اسلام کی پہلی سیڑھی کے بعد ”عبادتِ ربّ“ کی یہ دوسری سیڑھی منطقی طور پر بہر مربوط ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ﴾۔

تیسری سیڑھی: افعالِ خیر‘ خدمتِ خلق

لیکن اسی پر بس نہیں‘ ابھی اس سے آگے ایک تقاضا اور بھی ہے: ﴿وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ﴾ نیک کام کرو‘ بھلے کام کرو‘ خلقِ خدا کی خدمت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ ((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ)) —— اسے یوں سمجھئے کہ اللہ کی عبادت کا تقاضا تو اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے پورا ہو جائے گا‘ لیکن اس سے آگے بھی انسان کے لیے نیکی کا‘ خیر کا‘ بھلائی کا ایک وسیع و عریض میدان ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا سورۃ البقرۃ میں: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ﴾ کہ ہر کسی نے اپنا کوئی نہ کوئی ہدف بنایا ہوا جس کی طرف اُس کا رُخ ہے‘ پس اے اہل ایمان! تم نیکیوں میں‘ بھلائیوں میں‘ حسنات میں‘ خیرات میں‘ صدقات میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو جہاں تک عبادت کا تقاضا ہے وہ تو احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے پورا ہو گیا‘ لیکن اب آگے بڑھو‘ یہ خدمتِ خلق کا میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ ہے مفہوم ”وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ“ کا۔

البتہ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ خدمتِ خلق کا ابتدائی درجہ یقیناً وہی ہے جس سے سب واقف ہیں‘ یعنی بھوکے کو کھانا کھلانا‘ کسی کے پاس تن ڈھانپنے کو اگر کچھ نہیں ہے تو اس کا تن ڈھانپ دینا‘ کسی بیمار کے علاج معالجے اور دوا دارو کا اہتمام کر دینا‘ کسی کی عیادت یا مزاج پرسی کر دینا وغیرہ۔ حضور اکرم ﷺ نے تو اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ فرمایا: ((تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ اَخِيْكَ صَدَقَةٌ)) ”اپنے کسی ملاقاتی سے کشادہ روئی اور متبسم چہرے کے ساتھ ملاقات کر لینا بھی صدقہ ہے“۔ یہ بھی خیر اور نیکی کا کام ہے کہ وہ آئے تو آکر پشیمان نہ ہو کہ میں خواہ مخواہ کیوں آیا‘ بلکہ وہ محسوس کرے کہ تمہیں اس سے مل کر ایک فرحت ہوئی ہے‘ تاکہ اس کی طبیعت میں بھی ایک انبساط پیدا ہو۔ تو یقیناً خیر‘ بھلائی‘ نیکی اور خدمتِ خلق کا بنیادی تصور یہی ہے‘ لیکن اسے ایک بلند تر سطح بھی ہے۔

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

وہ بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی غلط رُخ پر پڑ گئی ہے اور وہ لوگ کہ جو اپنی غفلت اور نادانی کے باعث ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں‘ ان کی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنا۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے کہ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ ہے‘ تم اس میں گر پڑنا چاہتے ہو اور مَیں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر تمہیں گھسیٹ کر اس ہلاکت خیز انجام سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ چنانچہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دینا اور بھولے اور بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم اور سواءُ السبیل پر لے آنے کی کوشش کرنا درحقیقت خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح ہے۔ موٹی سی بات ہے‘ ہم خود سوچ سکتے ہیں‘ ایک انسان کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو

اگر آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا حاصل اگر وہ سموچا آگ کا نوالہ بننے والا ہے! آپ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا دار و مدار دراصل اس بات پر ہے کہ آیا آخرت پر یقین ہے یا نہیں؟ اگر یقین ہے تو جیسا کہ ہم سورۃ التحریم میں پڑھ آئے ہیں کہ کسی شخص کو اگر آخرت کا یقین ہے تو وہ اپنی اولاد اور اپنے اہل وعیال کے بارے میں سب سے بڑھ کر جس چیز کے لیے کوشاں ہو گا وہ ان کی آخرت کی بھلائی ہو گی۔ اگر آخرت نگاہوں کے سامنے ہے ہی نہیں تو ظاہر بات ہے کہ اپنے اہل وعیال کی صرف دنیوی منفعت ہی پیشِ نظر رہے گی۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کی باطنی آنکھ کھل چکی ہے اور جسے آخرت کی حقیقت نظر آ گئی ہے اصل خدمتِ خلق کا کام خلقِ خدا کو راہِ ہدایت پر لانا ہو گا کہ جس سے ان کی ابدی زندگی، ہمیشہ کی زندگی سنور جائے۔ اگرچہ ظاہر بات ہے کہ ایسا شخص اس دنیا میں بھی کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھے گا۔ آیۂ بر میں ہم تفصیل کے ساتھ پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ اسی حقیقت کو حضور ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا تھا: ((مَنْ یُّحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَیْرَ کُلَّهٗ)) کہ جو شخص دل کی نرمی سے، دردمندی سے محروم ہے وہ گویا کُل کے کُل خیر سے محروم ہو گیا۔ تو خدمتِ خلق کے اس درجے کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں خدمتِ خلق کے یہ دونوں پہلو بتمام و کمال نظر آتے ہیں۔ وحی کے آغاز سے قبل بھی آپ ﷺ انسانیتِ کاملہ کی معراج پر فائز تھے۔ انسانی ہمدردی کا مادہ آپؐ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ ﷺ یتیموں کی خبرگیری کرنے، بیواؤں کی سرپرستی فرمانے، مساکین اور محتاجوں کی امداد کرنے اور مسافروں کی مہمان نوازی فرمانے میں پیش پیش تھے، جس کی سب سے بڑی شہادت آپؐ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر دی تھی جب پہلی وحی کے بعد آپؐ پر بربنائے طبع بشری کچھ گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی۔ جب آپ ﷺ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ تو اب آپؐ کی پوری زندگی، آپؐ کی تمام توانائیاں، آپؐ کا ایک ایک لمحہ بسر ہو رہا ہے خلقِ خدا کو آخرت کے برے انجام سے بچانے کی کوشش میں۔ یہی خدمتِ خلق کی معراج ہے۔ یہ اس کی بلند ترین منزل ہے۔

چڑھائی تو بہر طور چڑھنی ہے!

بہرحال پہلی آیت میں یہ تین سیڑھیاں سامنے رکھ دی گئیں کہ اب تمہیں چڑھنا ہو گا۔ ایک عجیب آیت قرآن مجید میں سورۃ المدثر میں وارد ہوئی ہے: ﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾﴾ ''ہم چڑھوائیں گے اُسے بلندی''۔ ولید بن مغیرہ کے ذکر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ آخرت کے عذاب کا نقشہ کھینچا گیا کہ وہاں چڑھایا جائے گا اسے بلندی پر، اسے بلندی چڑھوائی جائے گی۔ یہ بلندی انسان کو بہرحال چڑھنی پڑے گی، اس دنیا میں چڑھ لے یا پھر آخرت میں وہ یہ چڑھائی چڑھنے پر مجبور ہو گا۔ اس دنیا میں اہل ایمان کو عمل صالح کی چڑھائی چڑھنی ہو گی۔ اسی طرح دین کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے محنت اور جدوجہد درکار ہو گی، سیڑھی بہ سیڑھی چڑھنا ہو گا۔ ہم پر تو ارکانِ اسلام کی پابندی ہی بہت شاق ہے۔ اس سے اوپر پوری زندگی میں اللہ کی اطاعتِ کاملہ ہمارے اعتبار سے بہت بھاری، بہت ثقیل، بہت مشکل معلوم ہوتی ہے ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ الا را!

پھر اس سے اوپر بھی ایک تقاضا ہے دین کا۔ اپنے آپ کو ہمہ تن خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کر دینا، اس کے لیے وقف کر دینا، اور لگا دینا۔ یہ ہے مطالباتِ دینی کی تیسری منزل۔

فلاح کی اُمید!

ان تین تقاضوں کے بیان کے بعد فرمایا: ﴿لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾ ''تاکہ تم فلاح پاؤ!'' 'لَعَلَّ' کا اس انداز میں ترجمہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے، ورنہ

''لَعَلَّ'' کا اصل لفظی مفہوم عربی زبان میں ''شاید'' کا ہے۔ گویا لغوی ترجمہ یوں ہوگا ''شاید کہ تم فلاح پاؤ''۔ لیکن چونکہ شاہانہ کلام میں لفظ ''شاید'' اگر آئے تو وہ ایک حتمی وعدے کی صورت ہوتا ہے، جیسے کوئی بادشاہِ وقت اگر اپنے کسی درباری سے یہ کہے کہ تم یہ کام کرو شاید کہ ہم تمہیں فلاں چیز دیں تو دراصل یہ ایک پختہ وعدہ ہے۔ اس لیے سورۃ الحج کی اس آیت میں ہم ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ لیکن اس آیت کے حوالے سے بھی کم سے کم اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوجاتی ہے کہ یہ فلاح ایسے ہی حاصل ہوجانے والی چیز نہیں ہے، یہ اتنی بے وقعت شے نہیں ہے کہ بس زبان سے چند کلمات ادا کرنے سے حاصل ہوجائے۔ اگر اسلام اور ایمان کا صرف زبانی اقرار کافی ہوتا تو ان الفاظ مبارکہ کا یہاں لانا کہ ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ یہ سب تحصیل حاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ سارا کلام نعوذ باللہ من ذٰلک ایک مہمل اور عبث کلام قرار پائے گا، اگر کوئی یہ سمجھے کہ فلاح اس کے بغیر بھی حاصل ہوتی ہے۔

یہاں گویا کہ اس آیۂ مبارکہ کی شکل میں وہ پورا سبق ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے آ گیا جو سورۃ العصر کا حاصل اور ہمارے اس پورے علمی و ذہنی سفر کا نقطۂ آغاز ہے: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝﴾ ''وہاں وہ بات منفی اسلوب میں تھی۔ ''زمانہ گواہ ہے کہ یقیناً تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے'' ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ ''سوائے اس کے جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور وصیت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں''۔ یہاں دیکھئے وہی بات ایک مثبت اسلوب میں آئی ہے کہ اگر فلاح کے طالب ہو، کامیابی چاہتے ہو، رشد سے ہم کنار ہونا چاہتے ہو تو تمہیں محنت و مشقت لازماً کرنی ہوگی۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!

وہ محنت کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہے سورۃ الحج کی اس آیت میں کہ: ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ پہلی چیز ہے نماز، اور اس کے ساتھ ہی گویا بقیہ ارکانِ اسلام زکوٰۃ، روزہ اور حج بھی اس کے تابع ہیں اور ان کا التزام بھی ضروری ہے۔ پھر دوسرا تقاضا بندگیٔ ربّ کا ہے ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ کہ ہر معاملے میں اپنے ربّ کی اطاعت پر کمربستہ ہوجاؤ، پوری زندگی اس کے حوالے کر دو اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ بھلائی پر، خدمتِ خلق پر کمربستہ ہوجاؤ۔ لوگوں کی خیرخواہی، لوگوں کی فلاح، خلقِ خدا کی ابدی بہبود کے لیے اپنی قوتیں، اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر دو، اپنے اوقات لگاؤ اور کھپاؤ! یہ ساری محنت کرو تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ شاید کہ تم کامیاب ہوجاؤ۔ اس کے بعد دوسری آیت میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، سورۃ العصر میں بیان کردہ نجات کی چار شرائط میں سے آخری دو یعنی ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کے لیے ایک جامع اصطلاح آگئی ''جہاد''۔

جہاد کی اہمیت

اب ذرا جہاد کی اہمیت کے حوالے سے دونوں آیات کا موازنہ کیجیے! پہلی آیت میں چار فعل آئے تھے: ارْكَعُوْا، وَاسْجُدُوْا، وَاعْبُدُوْا اور وَافْعَلُوْا، اور اس دوسری آیت میں جو حجم کے اعتبار سے بہت طویل ہے صرف ایک فعل امر آرہا ہے ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ معلوم ہوا کہ جہاد کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری آیت جہاد اور اس کی غرض و غایت ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

فرمایا ''جہاد کرو اللہ کے لیے''۔ ''فِی اللّٰهِ'' دراصل فی سبیل اللہ کا مخفف ہے۔ مراد ہے اللہ کی راہ میں ''in the cause of Allah'' یا یوں کہیے: ''for the cause of Allah'' اس کے لیے محنتیں کرو، جدوجہد کرو، کوششیں کرو۔ کشمکش، تصادم اور مجاہدہ اس میدان میں ہونا چاہیے۔ یہ تمہارے ایمان کا چوتھا بنیادی تقاضا ہے۔

''حَقَّ جِهَادِهٖ'' کا حقیقی مفہوم

یہاں نوٹ کیجیے کہ اس رکوع کے پہلے جزو میں شرک کی مذمت اور اس کے سبب

کے بیان کے ضمن میں الفاظ وارد ہوئے تھے : ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ وہی اسلوب یہاں ہے : ﴿جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ یہ محنت' کوشش' جدوجہد اور تصادم ہوگا اللہ کے لیے' جس پر تم ایمان لائے ہو' جسے تم نے اپنا مطلوب ومقصود اور محبوبِ حقیقی قرار دیا ہے' اور یہ جہاد اور مجاہدہ' کوشش اور یہ سعی اتنی ہونی چاہیے جتنا اور جیسا کہ اس کا حق ہے۔ غور کرو کہ تم پر کس کا کتنا حق ہے! کیا تم خود اپنے خالق ہو کہ اپنے نفس کے تقاضوں اور اس کے حقوق ہی کے پورا کرنے میں اپنی تمام توانائیاں' اپنی قوتیں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہو؟ سوچو' کس کے تم پر کتنے حقوق ہیں! والدین کے حقوق ہیں' ادا کرو! لیکن غور کرو کہ والدین کے دل میں محبت وشفقت کے جذبات پیدا کرنے والا کون ہے؟ تم پر کس کا حق کتنا ہے' معین تو کرو۔ اگر کوئی اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے وطن کے لیے وقف کر چکا ہے تو کیا صرف وطن کے حقوق کی ادائیگی ہی اس کے ذمے تھی؟ یہ درست ہے کہ وطن کا زیر بار احسان ہر شخص ہوتا ہے۔ وہ زمین کہ جس سے اس کے لیے غذا کے خزانے ابلتے رہے ہیں یقیناً اس کا ایک احسان اس کی گردن پر ہے۔ لیکن احسانات کو ناپو تو سہی' کس کا کتنا حق ہے! معلوم ہوگا کہ تمام حقائق پر فائق حق اللہ کا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام حقوق اللہ کے حقوق کے تابع ہو جائیں۔ وہ بات جو شرک کی حقیقت کے ضمن میں ''شرک فی الحقوق'' کی بحث میں کافی تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اسے یہاں اپنے ذہن میں تازہ کیجیے کہ انسان پر اوّلین حق اللہ کا ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں یہ مضمون آیا تھا: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ﴾ ''کہ شکر کر میرا اور اپنے والدین کا''۔ اگر یہ فہرست مرتب کی جائے کہ انسان پر کس کس کے حقوق ہیں تو سرفہرست آئے گا اس کا خالق و مالک' اس کا پروردگار' اس کا پالن ہار۔ جس نے اسے عدم سے وجود بخشا' جو اس کی کل ضروریات فراہم کر رہا ہے' جو اسے درجہ بدرجہ تدریجی مراحل سے گزارتا ہوا ترقی کے مراحل طے کرا رہا ہے' وہ ہے کہ جس کے حقوق سب سے فائق ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان یقیناً صد فی صد درست ہے کہ ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''تمہارے نفس کا تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے''۔ یہ سب حقوق تسلیم' لیکن یہ طے ہے کہ اللہ کا حق سب سے فائق ہے۔ تو اب ذرا سوچو کہ تمہاری توانائیوں کا کتنے فیصد اپنے نفس کے لیے صرف ہو رہا ہے! کتنے فیصد تم اپنی اولاد کے لیے صرف کر رہے ہو' کتنا جزو اپنی توانائیوں کا تم نے اپنی قوم یا وطن کے لیے وقف کیا ہے اور اس کا کتنا حصہ ہے جو تم نے خدا کے لیے وقف کیا ہے؟ ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ کہیں کسی محفل میں ذرا سا کلمۂ خیر کہہ دینے یا دین کے کسی کام پر کوئی چندہ دے دینے سے یہ سمجھ لینا کہ اللہ کا حق ادا ہو گیا' انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شریک ہونے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے! یہاں اس کا سدّ باب کیا جا رہا ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ واقعتاً انسان کی شخصیت کے دو ہی پہلو ہیں' ایک اس کا علم اور فکر ہے' اس کی نظری اور فکری قوتیں ہیں' اور دوسرا اس کا عمل ہے' بھاگ دوڑ ہے' سعی وجہد ہے' اس کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار آنا ہے۔ ان دونوں کا جو نقطۂ عروج ہے اس کو اس رکوع کے دو حصوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک ہے اللہ کی معرفت' اللہ کا اندازہ جیسا کہ اس کا حق ہے : ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ اور دوسرا ہے اللہ کے لیے محنت' بھاگ دوڑ اور سعی و جہد۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہ انسان کا جینا اور مرنا' جاگنا اور سونا' بیٹھنا اور اٹھنا' یہ سب درحقیقت اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ اسی کے لیے جدوجہد' اسی کے لیے کوشش' اسی کے لیے بھاگ دوڑ' گویا اسی میں انسان ہمہ تن اپنے آپ کو جھونک دے' یہ ہے ﴿جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾۔

فریضۂ رسالت کی ادائیگی اب اُمت کے ذمے ہے!

اگلا لفظ بہت ہی معنی خیز اور قابل توجہ ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ کہ اے مسلمانو' اے ایمان کے دعوے دارو اور اے ہمارے رسول محمد ﷺ کے اُمتی ہونے کے دعوے دارو!

تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو‘ تم اُسی طرح چن لیے گئے ہو جس طرح رسولؑ چنے ہوئے ہیں۔ لفظ ’’اصطفٰی‘‘ اور ’’اجتبٰی‘‘ عربی زبان کے دو بڑے قریب المفہوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ ان میں ایک باریک سا فرق بھی ہے جو انگریزی کے دو الفاظ ’’choice‘‘ اور ’’selection‘‘ میں ہے۔ ’’choice‘‘ میں پسند کرنے والے کی پسند کو زیادہ دخل ہوتا ہے‘ جبکہ ’’selection‘‘ فی الاصل کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ کسی معینہ ہدف کے لیے کسی موزوں ترین شخصیت یا جماعت کا انتخاب ’’selection‘‘ کہلائے گا۔ ’’اصطفاء‘‘ میں choice کا معاملہ ہوتا ہے اور اجتباء میں selection کا۔ لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ بہرحال بہت قریب المعنی ہیں۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ دونوں ہی الفاظ مستعمل ہیں۔ محمد مصطفیٰ اور احمد مجتبیٰ ﷺ۔ چنانچہ وہی لفظ جو رسولوں کے لیے مستعمل ہے یہاں اُمت کے لیے آیا ہے ’’هُوَ اجْتَبٰىكُمْ‘‘، تمہیں چن لیا گیا ہے‘ تمہیں پسند کر لیا گیا ہے‘ ایک مقصد عظیم کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ یہ مقصد عظیم کیا ہے؟ ذہن میں رکھیے کہ اس رکوع کے نصف اوّل میں نبوت و رسالت کے جس سلسلۃ الذھب کا بیان آیا تھا‘ اس سنہری زنجیر میں گویا ایک کڑی کا اضافہ ہوا ہے ختم نبوت کے باعث۔ اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ ہی کوئی اور رسول مبعوث ہو گا۔ چنانچہ خلقِ خدا پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت کا فریضہ اب اس اُمت کے سپرد کیا گیا ہے جو اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف۔ گویا کہ وہ ہدایت جس کی تلقی اوّلاً جبرئیل نے کی تھی اللہ سے‘ اور پہنچا دیا جسے محمد رسول اللہ ﷺ تک‘ اور پھر جسے پہنچایا محمد رسول اللہ ﷺ نے اُمت تک‘ اب اس اُمت محمدؐ کا فریضۂ منصبی ہے کہ وہ اسے پہنچائے پوری نوعِ انسانی تک۔ گویا یہ امت اس سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی (Link) کی حیثیت سے مستقلاً اس کے ساتھ جوڑ دی گئی‘ ٹانک دی گئی۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں الفاظ بالکل ہم وزن لائے گئے ہیں۔ وہاں فرمایا تھا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ اللہ چن لیتا ہے‘ پسند کر لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے ایلچی اور پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اور یہاں فرمایا: ’’هُوَ اجْتَبٰىكُمْ‘‘ اے مسلمانو‘ اے ایمان کے دعوے دارو! اب تم چن لیے گئے ہو‘ تمہارا انتخاب ہو گیا ہے ایک عظیم مقصد کے لیے۔

اُمت مسلمہ کا یہ ’’اجتباء‘‘ یا چناؤ کس مقصد کے لیے ہوا‘ اس کا جواب آگے آ رہا ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ کہ تمہارے اس ’’انتخاب‘‘ (selection) کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ رسول گواہ ہو جائیں تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ پوری نوعِ انسانی پر ___ یہ مقصد عظیم ہے جس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے

لیکن آیت کے اس ٹکڑے سے پہلے ایک ضمنی بات درمیان میں آئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک ’’subordinate clause‘‘ جملے کے بیچ میں شامل کر دی گئی ہے۔ چنانچہ جس اُمت پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے اس کی ہمت بندھانے کے لیے کچھ ترغیب و تشویق کے انداز میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ﴾ کہ اس دین کے معاملے میں اللہ نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ ان الفاظِ مبارکہ کا ایک عمومی مفہوم تو یہ ہے کہ یہ دین‘ دینِ فطرت ہے۔ خلافِ فطرت کوئی حدود اور قیود یہاں عائد نہیں کی گئیں۔ فطری تقاضوں کے اوپر کوئی غیر فطری بندش اور پابندی یہاں نہیں لگائی گئی۔ اس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے لیے معروف اور جانی پہچانی ہیں۔ ان سے انسان طبعاً مانوس ہے۔ اس پہلو سے یہ دین آسان دین ہے۔ اس میں کوئی تنگی نہیں‘ کوئی سختی نہیں‘ اس میں رہبانیت کی پابندیاں نہیں‘ اس میں نفس کو کچل دینے والی ریاضتیں نہیں‘ اس میں رسومات کا کوئی لمبا چوڑا طومار نہیں۔ بہت سادہ دینِ فطرت ہے۔

بنو اسماعیل کے لیے اضافی سہولت

آیت کا یہ مفہوم اُمت مسلمہ کے تمام افراد سے متعلق ہے‘ خواہ دنیا کے کسی بھی خطے

سے تعلق رکھتے ہوں' لیکن بالخصوص وہ لوگ جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے' جن سے اس اُمت محمدؐ کا نیوکلیس تیار ہوا' جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور اس ناطے سے ان کا رشتہ جڑتا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ' ان کے لیے اس پہلو سے بھی اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے کہ یہ تو ان کے جدامجد ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ یہ بیت اللہ جس سے محبت وعقیدت انہیں وراثتاً بھی ملی تھی انہی کا بنایا ہوا گھر ہے جس کے گرد طواف کا سلسلہ ان کے ہاں دورِ جاہلیت میں بھی جاری رہا' قربانی کا سلسلہ جاری رہا' منیٰ اور عرفات کا قیام جاری رہا' یہ سب چیزیں تو تمہاری نسلی اور قومی روایات کا جزو بن چکی ہیں۔ اس پہلو سے تمہارے لئے تو کوئی تنگی نہیں' اس دین کے اور تمہارے درمیان اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہیں۔ ہاں' جو غلط باتیں تم نے اس میں شامل کر دی تھیں ان کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح تمہارے جو اپنے رواج اور معاشرتی طور طریقے تھے بنیادی طور پر انہی کی اساس پر شریعت محمدیؐ کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ ان میں جو چیزیں غلط تھیں انہیں کاٹ پھینکا گیا اور جو صحیح تھیں انہیں برقرار رکھا گیا۔ لہٰذا یہاں خطاب کے اعتبار سے جو لوگ نبی اکرم ﷺ اور قرآن حکیم کے اوّلین مخاطب تھے ان کے حوالے سے کہا گیا: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ﴾ ''یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے''۔ تمہارے لیے اس کے قبول کرنے میں یا اس کے علمبردار اور پرچارک بننے میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے' کوئی اجنبیت کا پردہ حائل نہیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۬ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ ''اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان' پہلے بھی اور اس میں بھی''۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس اُمت کے لیے لفظ مسلمان تجویز کیا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی زبان پر یہ دعا جاری رہی: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار (مسلمان) بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک اُمت مسلمہ برپا کیجیو!'' تو تمہارا یہ نام تمہارے جدامجد نے رکھا ہے۔ اللہ نے بھی اس کتاب میں' اس کلام پاک میں تمہیں اسی نام سے موسوم کیا ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ اس پہلو سے گویا ایک مرتبہ پھر اعادہ ہو گیا اسی حقیقت کا جو اس سے پہلے سورۃ حٰمٓ السجدۃ کے درس میں آ چکی ہے کہ ایک داعی حق اور ایک داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا تعارف صرف بطور مسلمان کرائے: ﴿اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ کسی اور گروہی نسبت یا کسی تعلق کو نمایاں کرنا درحقیقت دعوتِ اسلامی یا دعوت الی اللہ کے مزاج کے منافی ہو جائے گا۔

شہادت علی الناس: اُمت کا فرضِ منصبی

یہ ضمنی مضمون تھا۔ اس کے بعد اگلے الفاظِ مبارکہ کو جوڑ لیجیے: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ سے۔ کہ اے مسلمانو! تمہارا انتخاب ہو گیا ہے' تم چن لیے گئے ہو ایک مقصد عظیم کے لیے۔ اور وہ مقصد عظیم ہے کہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب کارِ نبوت کی ذمہ داری مجموعی طور پر تمہارے کاندھوں پر ہے۔ شہادت علی الناس کا فریضہ جو انبیاء ادا کرتے رہے وہ اب تمہارے ذمے ہو گا۔ اللہ کی طرف سے خلق خدا پر اتمام حجت' اللہ کا پیغام خلق خدا تک پہنچا دینا' جیسے کہ پہنچا دینے کا حق ہے' اور اپنے قول و عمل سے اس دین اور اس توحید کی شہادت دینا' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ع ''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!''—— یہ سب کام اب تمہیں بحیثیت اُمت کرنے ہوں گے۔ ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ﴾ ''تاکہ ہو جائیں رسول گواہ تم پر''—— انہوں نے تو ابلاغ و تبلیغ کا حق ادا کر دیا' انہوں نے اللہ کا کلام تمہیں پہنچا دیا خواہ اس راہ میں انہیں ماریں کھانی پڑیں' گالیاں سننی پڑیں' استہزاء اور تمسخر کا ہدف بننا پڑا' ان پر پتھروں کی بارش ہوئی' ان کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور خواہ انہیں اپنے قریب ترین اعزہ کی جانوں کا نذرانہ اللہ کے حضور میں پیش کرنا پڑا۔ ذرا تصور میں لائیے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے اعضاء بریدہ لاشے کو۔ ناک کٹی ہوئی' کان کٹا ہوا' اسی پر بس نہیں' سینہ چاک کر کے کلیجہ تک چبا ڈالا گیا تھا—— محمد ﷺ نے یہ سارے شدائد جھیلے' تمام مصیبتیں برداشت

کیں‘ مسلسل تئیس برس تک سخت ترین مشقت سے آپ کو سابقہ رہا۔ اس میں تین برس کی وہ قید بھی ہے‘ شعب بنی ہاشم کی قید‘ جس میں سخت ترین فاقہ اور شدید ترین بھوک کی آزمائش بھی آئی۔ اسی میں وہ یوم طائف بھی ہے جس کا نقشہ یہ ہے وہ ہر طرف سے پتھراؤ ہو رہا ہے‘ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا ہے! پھر اس میں غارِ ثور کا وہ صبر آزما مرحلہ بھی ہے‘ اس میں وہ دامن اُحد کا جاں گسل معرکہ بھی ہے‘ اس میں بدر و حنین کے تمام مراحل آئے‘ لیکن ان تمام مراحل کا نتیجہ کیا ہے؟ محمد ﷺ نے اللہ کی توحید کی گواہی اس شان سے دی کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے کلام کا ابلاغ اس طور سے فرمایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے دین کی گواہی اپنے قول سے بھی دی اور عمل سے بھی دی۔ اور اس دین کے نظام کو عملاً برپا کر کے دکھا دیا‘ تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر نہ رہے‘ کوئی یہ بہانہ پیش نہ کر سکے کہ اے اللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہی

چنانچہ ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے! حجۃ الوداع کا موقع ہے‘ عرفات کا میدان ہے‘ حضور ﷺ نے اپنے اس آخری حج میں متعدد خطبے ارشاد فرمائے‘ عرفات کے میدان میں بھی اور منیٰ کی وادی میں بھی۔ تئیس برس کی محنت شاقہ کا حاصل‘ ایک لاکھ سے زائد افراد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے۔ عرب کے کونے کونے سے کھنچ کر آئے ہوئے لوگ جمع ہیں۔ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں جس کے آغاز ہی میں آپؐ یہ فرما کر لوگوں کو چونکا دیتے ہیں کہ لوگو شاید دوبارہ اس مقام پر ملاقات نہ ہو! گویا اشارہ دے دیا گیا کہ یہ الوداعی خطبہ ہے‘ آخری باتیں ہیں جو حضور ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں۔

اسی خطبے میں وہ الفاظ بھی آئے جن کا حوالہ سورۃ الحجرات کے درس کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کا ملخص‘ لبِ لباب اور اہم نکات کو بتکرار اعادہ بیان فرمایا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ عورتوں اور غلاموں کے حقوق کی طرف آپؐ نے انتہائی تاکیدی انداز میں توجہ دلائی۔ بڑا مفصل خطبہ ہے جسے پورا نقل کرنا یہاں پیشِ نظر نہیں ہے۔ خطبے کا اخیر میں آپؐ پورے مجمع سے ایک سوال کرتے ہیں: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ لوگو کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ صحابہ کرامؓ کا عام معمول یہ تھا کہ حضور ﷺ جب بھی بغرضِ تعلیم ان سے کوئی سوال کرتے تھے تو صحابہؓ بالعموم اوّلاً اس کے جواب میں کہتے تھے اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ (یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں) پھر جب آپؐ دوبارہ یا سہ بارہ سوال کرتے تو تب وہ اپنی سمجھ کے مطابق مختصر سا جواب دیتے تھے۔ لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافِ معمول اس ایک سوال کا مفصل جواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیک زبان دیا کہ ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ'' بلکہ ایک روایت میں مزید تفصیل وارد ہوئی: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ'' کہ اے نبیؐ ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق امانت ادا کر دیا‘ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا‘ آپؐ نے حق نصح و خیر خواہی ادا کر دیا'' آپؐ نے گمراہی کے پردوں کو چاک کر دیا اور ہدایت کا سراجِ منیر اور خورشید تاباں آپؐ کی کوششوں کے نتیجے میں اس وقت نصف النہار پر چمک رہا ہے ——

حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ گواہی تین مرتبہ لی۔ پھر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور تین مرتبہ زبان سے یہ الفاظ ادا فرمائے: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ''، تفصیل یہاں تک آتی ہے کہ آپؐ نے اپنی انگشت شہادت سے پہلے اشارہ فرمایا آسمان کی طرف‘ پھر لوگوں کی طرف‘ زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ'' کہ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ کہ میں آج سبکدوش ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو گئی۔ تیری ایک امانت مجھ تک پہنچی تھی بواسطہ جبریل۔ پیغام تھا نوعِ انسانی کے لیے۔ میری حیثیت امین کی تھی‘ میں نے وہ ذمہ داری ادا کر دی۔ میں نے وہ پیغام لوگوں تک پہنچا دیا اور ان سے گواہی لے لی ہے کہ میں نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا کر دیا ہے۔

حضور ﷺ نے صحابہؓ سے گواہی کیوں لی؟

غور کرنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اس اہتمام کے ساتھ یہ گواہی کیوں لی۔ درحقیقت منصب نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا جہاں ایک طرف باعث عز و شرف ہے وہاں

دوسری طرف یہ ایک انتہائی کٹھن اور نازک ذمہ داری بھی ہے۔ ایک سادہ سی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ اپنے کسی عزیز کو کوئی پیغام بھیجیں کہ فلاں کام فلاں وقت تک ضرور ہو جائے‘ ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ نے کسی کی معرفت وہ پیغام بھیجا۔ گویا درمیان میں ایک ایلچی ہے جو آپ کے پیغام کو آپ کے عزیز تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ فرض کیجیے وہ کام نہیں ہوا۔ اب آپ تحقیق و تفتیش کریں گے کہ اس کام کے نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے! اگر تو پیغام پہنچ گیا تھا اور پھر اس عزیز نے وہ کام نہیں کیا تو آپ کا سارا گلہ شکوہ اس سے ہوگا‘ وہ ایلچی بری قرار پائے گا‘ اور اگر کہیں اس ایلچی نے کوتاہی کی ہے‘ اس نے پیغام پہنچایا ہی نہیں‘ تو ظاہر بات ہے کہ آپ اپنے اس عزیز سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتے‘ سارا بوجھ آئے گا تو اس ایلچی پر کہ جس نے وہ ذمہ داری ادا نہ کی۔ یہ ہے وہ نازک اور کٹھن ذمہ داری جو انبیاء و رسل کے کندھوں پر آتی ہے۔ اُن کی جانب سے اگر ابلاغ میں اور پہنچانے میں بالفرض کوئی کمی رہ جائے تو بقیہ انسانوں سے باز پرس کی نوبت تو بعد میں آئے گی‘ پہلے ان کی جواب طلبی ہو جائے گی۔ یہ بار سورۃ الاعراف کے آغاز میں نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ ”ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی“۔ اور یہ ہے اس آیت کا حاصل کہ: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ (المائدۃ:۶۷) ”کہ اے نبیؐ پہنچا دیجیے جو کچھ نازل ہوا ہے آپؐ پر آپؐ کے ربّ کی جانب سے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوئی تو یہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی شمار ہوگی۔ اگرچہ بظاہر احوال اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں کہ اس معاملے میں نبی اکرم ﷺ سے کسی کوتاہی کا صدور ہوتا‘ لیکن یہاں دراصل مقامِ نبوت و رسالت کی نزاکت کا اظہار مقصود ہے۔

یہ بات ایک اور انداز میں بالکل آغاز ہی میں ان الفاظ میں واضح کر دی گئی تھی کہ ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝﴾ (المزمل) ”ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں“۔ ایک بہت بڑی ذمہ داری آپ کے کاندھے پر آنے والی ہے۔ یہ ہے وہ بارِ امانت جو نبی اور رسول کے کندھے پر ہوتا ہے۔ رسول اس کو پہنچا کر بری ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے گواہی دے دی حق کی‘ صداقت کی‘ توحید کی اور جو بھی اللہ کا پیغام آیا تھا اس کی۔ یہ گواہی اس نے قولاً بھی دے دی اور عملاً بھی۔ اور پھر لوگوں سے بھی یہ گواہی لے لی کہ ”میں نے پہنچانے کا حق ادا کر دیا!“ اب وہ بری ہو گیا۔ یہ ہے شہادت علی الناس۔ اسی کا ظہور ہوگا روزِ قیامت میدانِ حشر میں جب انفرادی محاسبے سے پہلے اُمتوں کے محاسبے کا مرحلہ آئے گا اور اُمتوں کو اجتماعی جواب دہی کے لیے کٹہرے میں آنا پڑے گا۔

رسولوں کی گواہی اپنی اُمتوں کے خلاف!

قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر یہ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس وقت ہر اُمت کی طرف بھیجا جانے والا رسول پہلے سرکاری گواہ (Prosecution Witness) کی حیثیت سے کھڑا ہوگا اور یہ شہادت دے گا‘ testify کرے گا کہ اے ربّ! تیرا جو پیغام مجھ تک پہنچا تھا میں نے بلاکم و کاست پہنچا دیا تھا۔ اب یہ لوگ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں‘ یہ خود مسئول ہیں‘ یہ خود جواب دہ ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ النساء میں بڑی صراحت سے آئی ہے۔ اور ایک عجیب واقعہ سیرت النبیؐ کا اس کے ساتھ متعلق ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضورؐ! آپ کو قرآن سناؤں‘ آپ پر تو وہ نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں‘ لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور کیف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے امتثالِ امر میں سورۃ النساء کی آغاز سے تلاوت شروع کی اور جب آیت نمبر ۴۱ پر پہنچے جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝﴾

”کیا حال ہوگا اس دن جبکہ ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے‘ اور اے نبی

آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان لوگوں کے خلاف!''

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **حسبك! حسبك!** بس کرو! بس کرو! اب جو میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

یہ ہے وہ نازک ذمہ داری کہ نبی کو میدانِ حشر میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے اُمت کے خلاف دینی ہوگی کہ اے ربّ! میں بری ہوں' میں نے پہنچا دیا تھا اور اب یہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ جیسے کہ سورۃ المائدۃ کے اختتام پر نقشہ کھینچا گیا ہے کہ روزِ محشر حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال ہوگا: ﴿ءَ اَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَ اُمِّیَ اِلٰـہَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ (آیت ۱۱۶) ''اے مسیح! کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بنا لینا اللہ کے ساتھ؟'' جواب میں وہ عرض کریں گے کہ پروردگار! اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو تیرے علم میں ہوتا۔ میں نے تو وہی کچھ کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ میں نے تو انہیں تیری بندگی کی دعوت دی تھی۔ یہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے وہ شہادت اور گواہی جس کے لیے قرآنی اصطلاح ''شہادت علی الناس''۔ دنیا میں تبلیغ' تلقین اور ابلاغ کے ذریعے سے انسانوں پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت قائم کرنا' قولاً اور عملاً بھی۔ اور اسی کی بنیاد پر میدانِ حشر میں وہ گواہی ہوگی جس کی تفصیل سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ کے حوالے سے ہمارے سامنے آچکی ہے۔

تبلیغ دین کا کام اب اُمت مسلمہ کے ذمے ہے!

ہمارے لیے اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے گواہی لینے کے بعد آخری بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی: ''**فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ**'' کہ اب پہنچائیں وہ جو یہاں ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اللہ کے پیغام کو نوعِ انسانی تک پہنچانے کا جو فریضہ انبیاء سرانجام دیتے تھے وہ اب اس اُمت کے ذمے ہے۔ قرآن جو ابدی ہدایت نامہ ہے' اس کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ نے لے لیا۔ اب کسی نئی وحی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پیغامِ ربانی اپنے اتمامی اور تکمیلی درجے کو پہنچ چکا: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳) چنانچہ تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کے ساتھ ہی بعثت انبیاء و رسل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور آخر المرسلین قرار پائے اور اب اللہ کے پیغام کو خلق خدا تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ گویا اب کارِ نبوت' کارِ تبلیغ' کارِ دعوت' فرائض رسالت اور نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت یہ تمام کام اب تا قیامِ قیامت اُمت کے ذمے ہیں۔ یہ فرضِ منصبی' اے مسلمانو اب تمہارے کاندھوں پر اجتماعی حیثیت سے عائد کر دیا گیا۔ یہ ہے وہ عظیم فریضہ اور یہ ہے نبوت و رسالت کے اس ''سلسلة الذهب'' (سنہری زنجیر) میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کیے جانے کا مقام اور مرتبہ جو اے اُمت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تمہیں حاصل ہوا ہے:

﴿ہُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ وَ مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰہِیۡمَ ؕ ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَ فِیۡ ہٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ﴾

''اُمت وسط'' کا مفہوم

قرآن حکیم کے اسلوب سے متعلق اس اہم حقیقت کا بیان اس سے پہلے بھی متعدد بار ہوا ہے کہ اہم مضامین قرآن میں دو مرتبہ ضرور ملیں گے' تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے مقام پر وہی مضمون بالعموم عکسی ترتیب کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمیں یہاں نظر آتی ہے —— چنانچہ یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی آیا ہے۔ نوٹ کیجیے کہ سورۃ الحج کی اس آیت میں جو ہمارے زیر درس ہے' لفظ اُمت وارد نہیں ہوا ہے' گو اس کی تشریح میں مَیں نے بار بار لفظ اُمت استعمال کیا ہے' جبکہ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون لفظ اُمت کے حوالے سے وارد ہوا ہے: ﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا﴾ (آیت ۱۴۳) اے مسلمانو' غور کرو' تمہیں اُمت کیوں بنایا گیا! لغت میں ''اَمَّ یَؤُمُّ'' کے معنی قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ اس

اعتبار سے اُمت کے معنی ہوئے ہم مقصد لوگوں کا گروہ! ایک ایسی اجتماعیت اُمت کہلائے گی جو کسی ایک مقصد یا کسی ایک نصب العین کے گرد جمع ہو۔ اس اُمت مسلمہ کو' جسے سورۂ آل عمران میں ''خیر اُمت'' بھی کہا گیا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آیت ۱۱۰) یہاں سورۃ البقرۃ میں اُمت وسط قرار دیا گیا ہے۔

اُمت وسط کے دو معنی کیے گئے ہیں' ایک تو اس اعتبار سے کہ جو شے درمیانی ہوتی ہے' جو وسط کی ہوتی ہے' وہ بہترین ہوتی ہے۔ اس معنی میں اس کا ترجمہ ہوگا بہترین اُمت۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۰ اس مفہوم کی مزید تائید کر رہی ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ''وسط'' درحقیقت دو چیزوں کے مابین کڑی (Link) کو کہتے ہیں۔ گویا اب تم ایک کڑی (Link) کی حیثیت رکھتے ہو محمد ﷺ کے اور پوری نوعِ انسانی کے مابین۔ جس طرح جبرئیل علیہ السلام کڑی تھے اور محمد ﷺ کے درمیان! محمد ﷺ نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا کر اتمامِ حجت کر دیا' اس پر تم سے شہادت اور گواہی بھی لے لی۔ اب تم واسطہ اور ذریعہ (Link) ہو اس پیغام کے آگے پہنچنے کا۔ اب تمہارے ذریعے اس پیغام کو آگے پہنچنا اور پھیلنا ہے۔ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت تمہارے ذریعے ہونی ہے۔ تو یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے اے مسلمانو! تمہیں ''اُمتِ وسط'' بنایا گیا ہے۔

سورۃ الحج میں پہلے رسول کا ذکر تھا: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ﴾ اور اس کے بعد اُمت کا ذکر آیا: ﴿وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ میں ترتیب الٹ دی گئی ہے۔ یہاں اُمت کے ذکر سے بات شروع کی گئی: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (آیت ۱۴۳) تمہیں بھی قیامت کے روز بطورِ گواہ پیش ہونا ہوگا اور اللہ کے دربار میں یہ گواہی دینی ہوگی کہ اے اللہ نوعِ انسانی کے نام تیرا جو پیغام قرآن حکیم کی شکل میں محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہم تک پہنچا تھا ہم نے خلق خدا تک پہنچا دیا تھا' ہم نے حق تبلیغ ادا کر دیا تھا۔ اگر ہم نے اپنے اس فرضِ منصبی میں کوتاہی کی اور روزِ محشر ہم یہ گواہی نہ دے پائے تو سوچیے کہ دوسروں کے جرم سے بڑھ کر جرم ہمارا ہوگا۔ ہماری پکڑ پہلے ہوگی اور سب سے پہلے ہم مسئول اور ذمہ دار قرار دیے جائیں گے کہ تم اس ہدایت کے خزانے کے اوپر سانپ بن بیٹھے رہے' تم نے اس کو دوسروں تک پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

اُمت کی غفلت شعاری

خلق خدا ہم پر الزام دھرے گی کہ اے اللہ! یہ تھے تیرے دین کے علمبردار' یہ تھے تیرے کلام کے امین اور حامل' انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہم تک اسے نہیں پہنچایا بلکہ خود بھی اس پر عمل نہیں کیا' یہ اپنے وجود سے خود دین کے لیے ایک حجاب اور رکاوٹ بن گئے تھے۔ جارج برناڈ شا کا مشہور قول ہے کہ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کتاب اور کوئی ممکن نہیں' لیکن جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ذلیل قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا —— یہ ہے وہ عملی شہادت جو مسلمان اپنے وجود سے' اپنے حال سے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جہاد کا مقصدِ اوّلین: فریضۂ شہادت علی الناس

بہرحال یہ شہادت علی الناس' یہ ابلاغ و تبلیغ دین' یہ دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کرنا یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ اور مقصدِ اوّلین! یہ ہے وہ فرضِ منصبی جس کی ادائیگی کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنی ہوگی' اس کے لیے جان و مال اور اوقات کا ایثار کرنا ہوگا۔ خلق خدا پر خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کا حق تبھی ادا کیا جا سکے گا کہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ تیرا پیغام ہم تک پہنچایا ہی نہیں گیا! یہ ہے وہ مقصدِ عظیم جس کے لیے اس شد و مد کے ساتھ اس آیت میں جہاد کی تاکید کی گئی: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾

بسم اللہ کرو' عمل کے میدان میں قدم رکھ دو!

اب ہم اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصے پر پہنچ گئے ہیں جس میں بڑے ہی عملی انداز

میں یہ بات سامنے لائی گئی ہے کہ اگر بات سمجھ میں آ گئی' اپنے فرائض دینی کا شعور حاصل ہو گیا: ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ اور ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ کے حوالے سے مطالباتِ دین کی چاروں سیڑھیاں اگر نگاہوں کے سامنے آ گئیں' تمہیں اگر معلوم ہو گیا کہ ایمان کا تقاضا کیا ہے تو بسم اللہ کرو! قدم بڑھاؤ اور عمل کا آغاز کر دو! نوٹ کیجیے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے ''فَ'' کے حرف سے' جیسے دو مرتبہ یہ کلمہ ''فا'' بڑے بامعنی انداز میں آیا ہے سورۃ التغابن میں۔ اسی طرح کا معاملہ یہاں ہے: ﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ بسم اللہ کرو' پہلی سیڑھی پر قدم رکھو' یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو' سفر کا آغاز کر دو! فرائض دینی میں سے جو پہلا فرض ہے اُس کو تو پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑو' اس پر تو کاربند ہو جاؤ!

یہاں دیکھئے وہ بات جو میں نے آغاز میں عرض کی تھی کہ ''ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا'' میں محض نماز کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں۔ چنانچہ یہاں اُسی نماز کی کوکھ سے زکوٰۃ برآمد ہو گئی۔ آگے فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ اس پہلی سیڑھی پر قدم جما کر آئندہ کے مراحل کے لیے اللہ سے چمٹ جاؤ۔ عصمت کہتے ہیں حفاظت کو۔ اعتصام سے مراد ہے حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ اصل میں یہاں تصویر لفظی ہے کہ کسی بچے کو اگر کہیں کسی طرف سے اندیشہ ہو' خوف لاحق ہو تو وہ اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں قلعے میں آ گیا ہوں اور ہر خطرے سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ یہ ہے اعتصام۔ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ آئندہ کے مراحل کے لیے اللہ سے چمٹ جاؤ' اللہ کی حفاظت میں آ جاؤ' اللہ ہی کو اپنا مددگار سمجھو' اللہ کی تائید و توفیق پر بھروسہ رکھو! منزلیں بڑی کٹھن ہیں' ان فرائض کی ادائیگی آسان نہیں' ان میں سے ایک ایک سیڑھی بڑی ہی بھاری اور ایک پر ایک منزل بڑی کٹھن ہے' لیکن یہ کہ اللہ کا نام لے کر آغازِ سفر تو کرو —— ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے بسم اللہ کرو' اور آئندہ کے لیے اللہ پر توکل کرو' اسی پر بھروسہ رکھو! ﴿هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝﴾ ''وہ تمہارا مولیٰ ہے' تمہارا مددگار ہے پس کیا ہی اچھا ہے وہ مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ!'' جسے اُس کی حمایت میسر آ جائے اب اس سے بڑھ کر کسی کو کسی کی حمایت حاصل ہو گی! جس کو اس کی نصرت و تائید مل جائے اس سے بڑھ کر مطمئن اور بے فکر اور کون ہو گا!

''حبل اللہ'' کی تعیین

یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ ''وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ'' کے الفاظ میں ایک اجمال ہے۔ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے: (اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا) تو وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ کی مزید شرح ہمیں سورۂ آل عمران میں ملے گی: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آیت ۱۰۲) اب یہاں دیکھئے کہ ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' میں لفظی مناسبت موجود ہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آیت ۱) ''اللہ کی رسی کو مضبوط سے تھام لو۔ گویا وہاں اللہ سے چمٹنے اور اس کے دامن سے وابستہ رہنے کے لیے اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے۔ لیکن یہ سوال پھر باقی رہ گیا کہ اللہ کی وہ مضبوط رسّی کون سی ہے؟ اس سوال کا قرآن مجید میں جواب نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید کے اس اجمال کی مزید تفصیل ہمیں ملتی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات میں۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کے کسی اجمال کی تفصیل اور تبیین کرنا نبی اکرم ﷺ کا صرف حق نہیں آپ کا فرضِ منصبی ہے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ''اور نازل کیا ہم نے یہ ذکر آپ کی طرف تاکہ اے نبی آپ توضیح کر دیا کریں (مزید وضاحت کر دیا کریں) اُس کی کہ جو لوگوں کے لیے نازل کیا گیا''۔ چنانچہ مذکورہ بالا سوال کا جواب ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ایک فرمان میں ملتا ہے جس کو حضرت علیؓ نے روایت کیا ہے۔ وہ ایک طویل روایت ہے جس میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اسی میں یہ الفاظ بھی آپؐ نے ارشاد فرمائے: هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ! یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسّی!

سلسلۂ مضمون کو ذہن میں جوڑ لیجیے: ''وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ'' کی شرح مزید ہوئی

''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہ'' کے الفاظ سے۔ اور وہ حبل اللہ کون سی ہے؟ اس کا جواب ملا حدیثِ نبویؐ کے ذریعے کہ ''ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ'' اس سے اشارہ ہو گیا کہ اس سارے عمل یعنی مجاہدہ فی سبیل اللہ اور شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے مرکز و محور دراصل قرآن مجید ہوگا۔ یہ مضمون ہمارے منتخب نصاب کے اسی جزو میں سورۃ الجمعۃ کے ضمن میں تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين